مسلمان عورت

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد

تیسری منزل حسن مارکیٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

Cell: 0322-4786128 Ph: 042-37232731

www.maktabajamal.com Email: mjamal09@gmail.com

نام کتاب	:	مسلمان عورت
مصنف	:	مولانا ابوالکلام آزادؒ
ناشر	:	مکتبہ جمال، لاہور
اہتمام	:	میاں شبیر احمد کھٹانہ
مطبع	:	تایا سنز پرنٹرز، لاہور
سن اشاعت	:	2016ء
قیمت	:	220 روپے

مکتبہ جمال
MAKTABA JAMAL
تیسری منزل حسن مارکیٹ۔ اردو بازار۔ لاہور
Cell: 0322-4786128 Ph: 042-37232731
www.maktabajamal.com Email: mjamal09@gmail.com

فہرست

عرضِ ناشر

میرے لیے یہ انتہائی سعادت کی بات ہے کہ مجھے مولانا ابوالکلام آزاد کی یہ کتاب چھاپنے کا موقع ملا۔ پہلی بار یہ کتاب پاکستان کے قیام سے کئی سال پہلے شائع ہوئی۔ اس میں ایک ایسے موضوع کو زیر بحث لایا گیا ہے، جس کی اہمیت شاید کبھی ختم نہ ہو۔ دراصل عورت اور مرد کے درمیان جو نسبت ہے وہ اس قدر نازک ہے کہ اس میں ذرا سی کمی بیشی پورے معاشرے کے نظام کو درہم برہم کر دیتی ہے، جس زمانے میں مولانا آزاد نے اسے رقم کیا، اس وقت شاید یہ مسئلہ اتنا شدید نہ تھا لیکن یہ تو ہماری سوچ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت بھی امت مسلمہ کے بہی خواہ اس مسئلے کی شدت کم سے کم محسوس نہیں کر رہے ہوں گے اور اس کا ثبوت یہ کتاب ہے اور مولانا آزاد جیسے عظیم المرتبت عالم دین کی نظر اس پر پڑنا اور اس کتاب کی وقعت اور اہمیت کے لیے بہت کافی ہے۔ مسئلے کی سنگینی کا اندازہ لگائیے مولانا نے اپنی گوناگوں علمی، ادبی اور سیاسی مصروفیات کے باوجود اس کتاب کی ترجمانی کو ضروری سمجھا ورنہ یہ کام کسی اور کے سپرد بھی کر سکتے تھے۔ میں صرف اس کتاب کی سابقہ اشاعتوں سے متعلق چند باتیں عرض کروں گا۔

پہلی بات یہ ہے کہ کتاب بار بار شائع ہونے کی وجہ سے ناشروں کی شدید بے توجہی کا شکار رہی ہے۔ اس وجہ سے کتاب میں جابجا اغلاط ترکیبوں اور فقروں میں بے ربطی اور عدم توازن پیدا ہو گیا بلکہ ایک اشاعت کے بعد دوسری اشاعت کے لیے کسی پروف خوانی یا تصحیح کی ضرورت ہی محسوس نہ کی گئی اور کتابت کی غلطیاں بھی درست کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی گئی۔ بدیں وجہ پہلی نظر میں یہ محسوس ہوتا تھا کہ ترجمہ مولانا کا ہے ہی نہیں لیکن الفاظ کا چناؤ اور عربیت کی چھاپ اسے یقیناً انہی کی تحریر بتاتی ہے۔

اس کتاب کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فرید وجدی کی عربی کتاب "المراۃ المسلمہ" کا ترجمہ ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ کتاب جب شائع ہوئی تو مولانا نے دقت کی نزاکت اور اس کی معاشرتی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس پر تبصرہ لکھا یہ تبصرہ اتنا طویل ہو گیا کہ خود ایک کتاب بن گئی۔

میں اپنے دوست محترم اصغر نیازی صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے اس ترجمے کو نہ صرف پڑھا بلکہ پروف خوانی کے دوران کتابت کی غلطیوں کی وجہ سے تحریر میں جو بے ربطی پیدا ہو گئی تھی اسے بھی دور کرنے کی سعی کی۔

میاں مختار احمد کھٹانہ

❋❋❋
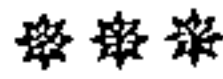
پیش لفظ

روایتی معاشرے جب اپنی بنیاد میں کسی بگاڑ کا شکار ہونے لگتے ہیں تو اس کے آثار سب سے پہلے ان کے تصور انسان میں نمودار ہوتے ہیں اور یہاں سے رفتہ رفتہ عقائد و اعمال کو بھی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ اسلام جس طرز حیات اور اسلوب معاشرت کو ضروری قرار دیتا ہے، وہ انسان اور انسانیت کے اسی ماڈل کے حصول، حفاظت اور پرداخت کے لیے ہے جس کے مستقل استحضار کے بغیر دین کے انسانی حوالے سے کوئی معنی باقی نہیں رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم نے مغرب کے تصور انسان پر صاد کر کے اس سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کا آغاز کیا تو پہلے ہی قدم پر زندگی کے ان اقدار سے روگردانی کی ضرورت پیش آئی جن کے ذریعے سے دین کا مطلوبہ انسانی ماحول، جس کے اصولی حدود کسی تغیر یا بالفاظ دیگر تاریخی دباؤ کو قبول نہیں کرتے، تشکیل پاتا ہے۔ اس ماحول میں عورت اور مرد قطبین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہی سے زندگی میں وہ توازن پیدا ہوتا ہے جس کے بغیر انسان کی حقیقی معنویت اور کارگاہ ہستی میں اس کا مجموعی کردار سامنے نہیں آ سکتا۔ عورت و مرد محض دو حیاتیاتی اصناف نہیں بلکہ حقیقت انسانی کے دو مظاہر ہیں۔ عورت میں اس حقیقت کا ارتکاز، سکون اور اندرونی پن کارفرما ہے اور مرد میں پھیلاؤ، حرکیت اور آفاقیت۔ مغربی تہذیب اس اصول کے انکار پر کھڑی ہے اور اس کے زیر اثر عالم اسلام میں بھی فکر و احساس کی جو تبدیلیاں برپا ہوئیں، ان کا بڑا اظہار آزادی نسواں کے مطالبے میں ہوا۔ یہ مطلوبہ آزادی فقط چادر اور چار دیواری سے نہیں بلکہ پورے دین سے نکلنے کی آزادی تھی۔ دینی حلقوں نے یہ بات تو بھانپ لی تھی لیکن اس کا مقابلہ کرنے کے لیے دنیا دینے اور چھین لینے کی جو طاقت درکار تھی، وہ ان کے پاس نہیں تھی۔ مغرب نے دنیا اور دنیاوی زندگی میں جیسی کشش اور پھیلاؤ پیدا کر دیا تھا، اس

نے آخرت کے تصور کو ہمارے طرز احساس اور تخیل کے لیے ایک اجنبی بلکہ ناگوار چیز بنا دیا۔ دین جسے معیاری زندگی کہتا ہے چونکہ اس کا بہت تھوڑا حصہ دنیا سے متعلق ہے، لہٰذا یہاں یہ سوال زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کہ دینی تقاضوں کی تعمیل سے دنیا پر کیا اثر پڑے گا؟ مسلمان کا تو سارا مسئلہ ہی یہ ہے کہ جینے کا وہ ڈھنگ اپنایا جائے جس سے آخرت سنور جائے۔ اسی لیے ان احکام کی پابندی بھی کسی قسم کے جبر کا احساس نہیں پیدا کرتی جن کا تعلق انسانی معاشرت، ذمہ داریوں کی تقسیم اور دنیاوی کردار سے ہے۔ اس رخ سے دیکھیں تو عورت کے لیے پردے کا حکم دراصل اس کو اپنے فطری کردار سے ہم آہنگ رکھتا ہے اور اس وجودی امتیاز کی حفاظت کرتا ہے جس سے مرد محروم ہے۔ مرد و عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ عورت کو مثال کے طور پر بے پردہ کر دینا، اس گاڑی میں سے ایک پہیہ نکال دینے کے مترادف ہے۔ اس سے زندگی کی اپنے مقصود کی طرف پیش قدمی رک جائے گی۔

زیر نظر کتاب ایک ایسے صاحب علم کی تصنیف ہے جو جدید تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا استدلال اس زمانے کی علمی فضا سے مطابقت رکھتا ہے۔ اسی لیے یہ کتاب خاصی مؤثر اور مقبول رہی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے بلند مرتبے سے تنزل کر کے اس کا مترجم بننا غالباً اسی وجہ سے قبول کیا کہ یہ تحریر جدید آدمی کی ذہنیت اور افتادِ طبع پر زیادہ اثر انداز ہو سکتی تھی۔ ویسے مولانا محض ترجمے تک محدود نہیں رہے بلکہ انہوں نے ایک نسبتاً آزادانہ ترجمانی کا طریقہ اپنایا جس سے اس کتاب کا درجہ اور بلند ہو گیا۔ یہ بات پورے یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ مولانا کا یہ آزاد ترجمہ علمی، استدلالی اور اسلوبی اعتبار سے اصل کتاب کے مقابلے میں کہیں بلند پایہ ہے۔

احمد جاوید

لاہور

❊❊❊

دیباچہ

پیش نظر کتاب فرید وجدی کی عربی تصنیف "المرأة المسلمه" کا اردو ترجمہ ہے جو اولین ثمر ہے، مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی مساعی کا اور تصنیفی صلاحیتوں کا اس کو ترجمہ ہم واقعیت کے اعتبار سے کہتے ہیں۔ ورنہ اس کو فرید وجدی کی کتاب کا اردو ایڈیشن کہنا چاہیے۔ یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ عالم اسلامی نے بالعموم اور مصر نے جس خصوصیت سے اور جس سرعت سے تہذیب مغربی کے سانچوں میں اپنے افکار و عمل کو ڈھالا ہے اس کی نظیر آپ کو دوسری جگہ نہیں ملے گی یوں تو یہ فتنہ عالم آشوب ہے مگر مصر اور اسلامی دنیا نے تو لوٹا ہی ٹیک دیا ہے۔

اس مرعوبیت اور احساس کمتری کو دور کرنے کے لیے مصر ہی کے ایک عالم کو اللہ نے منتخب فرمایا اور وہ اس طلسم کو توڑنے میں کامیاب رہے۔ فاضل موصوف نے تہذیب جدید کے اس خاص پہلو پر کہ عورت کے قدرتی فرائض تدبیر منزل کے فلسفہ کے منافی ہیں، چشم کشا بحث فرمائی ہے۔ اصل میں مغربی تغلب و استیلا نے ذہنوں کو اس درجہ مفلوج کر دیا ہے کہ انہیں اب اپنی ہر ادا سے نفرت محسوس ہوتی ہے اور ساحران فرنگ کی ہر چیز محبوب، یہ محکومی و غلامی کا لازمی نتیجہ ہے۔ غالب اقوام کی سیف و تیغ سے جہاں سر قلم ہوتے ہیں، وہاں ذہن و فکر بھی مجروح ہوتے ہیں اور بہت کم نفوس ایسے ہوتے ہیں جو ذہنی شکست سے اپنے افکار و خیالات کو محفوظ رکھ سکیں۔

علامہ ممدوح ان چند لوگوں میں سے ایک ہیں جو چٹان کی طرح اپنے مسلک پر قائم ہے۔

قاسم امین نے جب "تحریر المرأة" اور "المرأة الجدیدہ" کے نام سے دو کتابیں شائع کیں تو مصر میں ہلچل مچ گئی۔ نوجوان طبقہ خصوصیت سے ان خیالات سے متاثر ہوا اور اب اس موضوع پر کھلے بندوں تبادلہ خیالات ہونے لگا کہ اپنی مجلسی نظام کو جدید قدروں اور معیاروں پر

استوار کیا جائے۔ کئی لوگوں نے ان کتابوں کا جواب لکھا لیکن ان میں یہ جامعیت نہ تھی اور ان کی حیثیت دفاع کی تھی۔ علامہ فرید وجدی ترپ کر اٹھے اور فلسفہ وحکمت کے دلائل کا انبار لگا دیا۔ انہوں نے ثابت کیا کہ قصر اسلامی کی بنیادیں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں پر قائم ہیں۔ اس لیے ترمیم واصلاح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا دلائل کی تفصیل ونوعیت تو آپ اصل کتاب میں دیکھیں گے جو چیز قابل قدر ہے وہ کتاب کا طریق اسلوب ہے انہوں نے ہر ممکن پہلو سے موضوع بحث پر روشنی ڈالی ہے اور کہیں رکیک و پا افتادہ دلائل پیش نہیں کیے۔

مندرجات کی مختصر فہرست یہ ہے:

۱۔ عورت کیا ہے؟ یعنی اپنی فطری مجبوریوں اور جسمانی تقاضوں کے اعتبار سے اس میں اور مرد میں کیا فرق ہے؟

۲۔ عورت کے فطری اور قدرتی فرائض کیا ہیں؟

۳۔ کیا مرد اور عورت جسمانی طاقت میں مساوی ہیں؟

۴۔ کیا عورتیں عملی جدوجہد میں مردوں کا ساتھ کامیابی سے دے سکتی ہیں؟

۵۔ کیا پردہ عورت کی فطری صلاحیتوں کی تربیت کا قدرتی ذریعہ ہے؟

۶۔ کیا پردہ عورتوں کے لیے غلامی کی علامت ہے؟ اور کیا یہ حقیقی ترقی کے منافی ہے؟

۷۔ کیا موجودہ دور کی عورتیں کامل عورتیں ہیں؟

۸۔ مسلمان عورتوں کا طریق تعلیم کیا ہے؟

موصوف نے ان تمام مضامین پر فلسفہ، علم الحیات، نفسیات، عمرانیات اور تاریخی روشنی میں بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ عورت کی تمام مساعی کے لیے اصلی میدان گھر ہے اس کے قلب وذہن اور حسن وجمال کی تمام رعنائیاں اس لیے ہیں تا کہ تیرہ ودروں گھروں میں اس کی وجہ سے روشنی پیدا ہو۔ یہ رونق کا شانہ ہو شمع محفل نہ ہو۔ تاریخ کے اوراق آپ کے سامنے ہیں جب کبھی وہ دہلیز امن و سکون سے باہر نکلی ہے اور اس نے زندگی کی دشواریوں میں قدم رکھا ہے۔ مرد کے مصائب میں

اضافہ ہی ہوا ہے بلکہ تباہی و بربادی کے تمام واقعات میں یہی کچھ بالکل صاف طور پر آپ کو نظر آئے گا کہ اس میں عورت کا حسین ہاتھ کارفرما ہے۔ کتنے بڑے بڑے تمدن محض اس وجہ سے مٹے ہیں کہ وہاں زندگی کی اس دوئی میں ترتیب ملحوظ نہ رکھی گئی یعنی رزم و بزم کی سرحدوں کو ملا دیا گیا عورت تو اس لیے پیدا کی گئی تھی کہ ماں بنے اور امومت کے شرف سے بہرہ ور ہو۔ اس کو ہوس کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ اس صورتحال کو موجودہ دور کا پڑھا لکھا مگر بے وقوف انسان جس قدر جلد محسوس کر لے یہ اس کے لیے بہتر ہے ورنہ فطرت اپنا فرض سرانجام دیتے ہوئے ایسے تمدن کو تہہ و بالا کر دے گی جس کی بنیاد ادنیٰ درجہ کی خواہشوں کی تکمیل پر قائم ہے۔

مولانا محمد حنیف ندوی
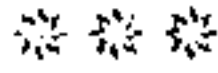
٭٭٭

مقدمہ

در رہ عشق نہ شد کس بہ یقیں محرم راز
ہر کسی بہ حسب فہم گمانے دارد

تعلیم اور خیالات کے اختلاف نے آج کل ہندوستان میں دو گروہ پیدا کر دیئے ہیں۔ قدیم تعلیم کی یادگار اور نئی تعلیم کا تربیت یافتہ، تقریباً یہی حال مصر کا ہے۔ نئے اور پرانے گروہوں میں جو حد فاصل یہاں نظر آتی ہے وہاں بھی قائم ہے لیکن اس مماثلت کے ساتھ بڑا فرق یہ ہے کہ یہاں نئی تعلیم نے ذریعہ ملازمت ہونے کے ساتھ اور کوئی فائدہ قوم اور لٹریچر کو نہیں پہنچایا لیکن مصر میں نئی تعلیم نے ذریعہ ملازمت کے ساتھ نسبتاً عمدہ نتائج پیدا کیے ہیں۔ نئے گروہ میں علمی مذاق پیدا ہو چلا ہے۔ جو تصنیفات آج عربی لٹریچر کا مایہ ناز سمجھی جاتی ہیں، تقریباً تمام تر نئے گروہ کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں نیا گروہ اگرچہ ضروریات زمانہ سے باخبر ہے اور یورپ کے قدم بقدم چلنا چاہتا ہے مگر چونکہ اپنی حالت کی بے خبری اور تعلیم کے نقص نے امتیاز کا صحیح مادہ سلب کر دیا ہے، اس لیے اس امر کی قدرت نہیں رکھتا کہ حسن و قبح میں تمیز کر سکے۔ برخلاف اس کے مصر کا نیا گروہ یورپ کی ہر ادا کو شیفتگی کے ساتھ دیکھتا ہے مگر ناقدانہ نگاہ بھی ڈالتا ہے۔ جو نئے مباحث یورپ کی تقلید نے پیدا کر دیئے ہیں وہ ہندوستان کی طرح مصر میں بھی پیش ہوتے رہتے ہیں مگر موافقانہ یا مخالفانہ جو کچھ اس پر لکھا جاتا ہے وہ یہاں کی نسبت زیادہ شائستہ اور مدلل ہوتا ہے۔

نئے مباحث میں ایک بڑی بحث عورتوں کی آزادی یا پردہ کی ہے۔ ہندوستان کی طرح مصر میں بھی پچھلے دنوں یہ بحث چھڑ گئی۔ مصر کی تعلیم یافتہ سوسائٹی کے ایک ذی اثر ممبر مسٹر قاسم امین بک ہیں جو کسی زمانہ میں پردہ کے موید تھے اور یورپ کی موجودہ آزادی کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے

تھے۔فرنچ میں ایک رسالہ بھی پردۂ اسلامی کی تائید میں لکھا تھا جس نے فرانس میں کچھ دنوں کے لیے ہلچل مچا دی تھی لیکن پچھلے دنوں ان کی رائے میں یکا یک انقلاب پیدا ہو گیا اور یورپ کی آزادی کی بجائے پردہ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ چونکہ گزشتہ غلطی کا کفارہ ضروری تھا اس لیے پردہ کی مخالفت اور آزادی نسواں کی ضرورت پر یکے بعد دیگرے دو رسالے لکھ کر شائع کیے جن میں سے پہلے رسالے کا نام "تحریر المراۃ" ہے اور دوسرے کا نام "اَلْمَرَاۃ الجدیدہ" ہے۔ان دونوں رسالوں نے اہل مصر کو نئے سرے سے اس مسئلہ پر متوجہ کر دیا۔قاسم امین بک کی تردید میں معمولی مضامین کے علاوہ پانچ رسالے علی الترتیب لکھے گئے ہیں۔جن میں سے ایک رسالہ بیروت کے کسی عالم کی تصنیف ہے اور چار رسالے مصر کے تعلیم یافتہ اشخاص کے قلموں سے نکلے ہیں۔ ان ہی رسالوں میں ایک رسالہ "المَراۃ المُسلمه" بھی ہے جو مصر کے مشہور مصنف فریدی وجدی کی تصنیف ہے۔اس رسالہ کے ذریعہ ہم اردو خواں پبلک کو اس کے قابل قدر مباحث سے واقف کرنا چاہتے ہیں جس سے ایک طرف تو آزادیِ نسواں کے مسئلہ پر روشنی پڑے گی اور دوسری طرف اس امر کا بھی اندازہ ہو جائے گا کہ مصر کا نیا علمی مذاق ہندوستان کے مذاق سے کس درجہ مختلف ہے۔

اہم خصوصیتیں

ہندوستان میں تقریباً بیس برس سے اس مسئلہ پر خامہ فرسائی ہو رہی ہے اور ایک خاص لٹریچر اس موضوع پر تیار ہو گیا ہے لیکن اس تمام دفتر کا یہ حال ہے کہ نئے گروہ نے جس قدر پردہ اور تنقید کی خرابیاں دکھائی از خود نہیں دکھائیں بلکہ یورپ کے اثر میں گرفتار ہو کر دکھائی ہیں۔ یورپ کے رعب نے اس طرح انہیں دم بخود کر دیا ہے کہ ایک لفظ بھی اس کی مخالفت میں نہیں لکھ سکتے اس لیے وہ یورپ ہی کی آواز ہے جو "ہیٹ" کی جگہ "طربوش" سے چھپے ہوئے سروں سے نکلتی ہے۔ جن لوگوں نے پردہ کی تائید میں رسالے لکھے ہیں ان میں بڑی جماعت قدیم تعلیم یافتہ لوگوں کی ہے۔ چونکہ ان لوگوں کی نظروں سے یورپ کا حال پوشیدہ ہے اس لیے وہ جو کچھ لکھتے ہیں مذہب کے بل پر لکھتے ہیں اور مذہب آج کل ایک ایسی چیز ہے جس کا جادو نئے گروہ پر کارگر نہیں ہو سکتا۔

فرید وجدی چونکہ یورپ کی متعدد زبانوں سے واقفیت رکھتا ہے اور خود تعلیم یافتہ سوسائٹی کا ایک فاضل ممبر ہے اس لیے اس نے جو کچھ لکھا ہے محض یورپ کے اقوال اور حالات کو پیش نظر رکھ کر لکھا ہے۔ اس بناء پر ظاہر ہے کہ "اَلْمَرْاۃُ الْمُسْلِمَۃ" جس قدر نئے گروہ پر اثر ڈال سکتی ہے، ہمارے یہاں کی مذہبی تحریروں سے اس قدر توقع نہیں ہو سکتی۔

عورتوں کی آزادی کا مسئلہ دراصل ایک معرکۃ الآراء مسئلہ ہے۔ یورپ کا طرز عمل اگرچہ اس کی تائید میں ہے لیکن جمہور کی آواز نہایت سختی سے اس کی مخالف ہے۔ ایک بڑی باریک بین جماعت موجود ہے جو اس آزادی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور اس خطرناک زمانہ کی یقین کے ساتھ منتظر ہے جو اس آزادی کا لازمی نتیجہ یعنی تمدن اور معاشرت کی بنیادیں متزلزل کر دے گا۔ ہمارے یہاں کے مخالفین پردۂ یورپ کے طرز عمل کو تو شوق کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں لیکن چونکہ نظریں کوتاہ اور معلومات محدود ہیں اس لیے مخالف جماعت کی آراؤں سے واقفیت نہیں رکھتے۔ پردہ کے مویدین یورپ کی زبانوں اور حالات سے محض بے خبر ہیں، اس لیے ان کی رائے بھی اس میدان میں سبقت نہیں لے جا سکتی۔ فرید وجدی چونکہ یورپ کے اقوال و حالات پر وسیع نظر رکھتا ہے اس لیے اس نے اول ان تمام لوگوں کی آراء میں ڈھونڈ کر جمع کی ہیں اور دکھلایا ہے خود اس ملک کے اہل الرائے اور موجودہ مدنیت کے مجدد اس طرز عمل کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ پھر مشاہیر علمائے یورپ کے خیالات پیش کر کے ہمدردانہ لہجہ میں نصیحت کی ہے کہ محض ظاہر آزادی کے کرشمہ پر بے خود نہ ہو جائے کیونکہ جن نتائج کی بناء پر آزادی کا شور مچاتے ہو، وہ خیر سے یورپ میں بھی مفقود ہیں۔

اہم مباحث

اس سرسری رائے کے بعد اب ہم "اَلْمَراۃ المُسلمۃ" کے اہم مباحث کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

عورتوں کی آزادی کی حمایت میں اس وقت جس قدر ذخیرہ جمع ہو چکا ہے اس میں اہم اور قابل بحث صرف تین مسئلے ہیں۔ ان کے علاوہ اور جتنی باتیں کی جاتی ہیں وہ دراصل ان ہی تین

مسئلوں کی شرح و تفسیر میں داخل ہیں۔

۱۔(ا) انسان فطرتاً آزاد ہے اور اس فطرتی آزادی میں کوئی خصوصیت ثابت نہیں ہوتی۔ پھر وہ کونسا معیار ہے جس کی بناء پر انسانوں کا ایک گروہ تو اس آزادی سے فائدہ اٹھائے اور دوسرا گروہ محروم رکھا جائے۔

(ب) جب انسانی قویٰ کی نشو ونما تمدنی اور شائستہ زندگی کے لیے ضروری ہے تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ عورتیں اس عقلی نشو ونما سے محروم رکھی جائیں؟ مردوں نے علوم و فنون، انتظام، سیاست اور دنیا کے تمام تمدنی مشاغل اپنے لیے مخصوص کر لیے ہیں اور عورتیں اس دنیا سے بالکل الگ رکھی گئی ہیں۔ اول تو انہیں تعلیم دی ہی نہیں جاتی اور اگر کسی کا نرم دل اس کے مظلومانہ حال پر متاسف ہوتا بھی ہے تو صرف معمولی تعلیم ان کے لیے کافی خیال کی جاتی ہے۔ کیا وہ انسان نہیں ہیں؟ کیا ان میں دماغی قوتیں موجود نہیں ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو کیا یہ صریح ظلم نہیں ہے کہ علمی دنیا کے شائستہ مشاغل سے انہیں یک لخت محروم کر دیا جائے۔

۲۔ اس وقت تک عورتیں علمی لذات سے محض ناآشنا ہیں اور یہ تمام تمدنی میدان کل کا کل مردوں کے قبضہ میں رہا۔ اس لیے یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ان میں مردوں کی طرح دماغی ترقی کی صلاحیت نہیں ہے کیونکہ اس وقت تک انہیں ترقی کا موقع ہی کب دیا گیا؟ آج علم تشریح اور فزیالوجی کی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ مرد اور عورت دماغی قوتوں میں بالکل برابر ہیں اور ثبوت کے ساتھ انہیں عام آزادی بھی دے دی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ میں کوئی کام ایسا نہیں ہے جسے مردوں کی طرح مغربی عورتیں انجام نہ دیتی ہوں۔ ڈاکٹر عورتیں ہیں، پروفیسر عورتیں ہیں اور لیکچرار عورتیں ہیں۔ غرض یہ کہ ہر میدان میں عورتیں مردوں کے برابر ترقی کر رہی ہیں۔ یہ نظیر بھی بتلا رہی ہے کہ اگر عورتوں کو مردوں کے تسلط سے نجات ملے اور اعلیٰ تعلیم سے مردوں کی طرح فائدہ اٹھائیں تو وہ کسی

چیز میں مردوں سے کم رتبہ ثابت نہیں ہوسکتیں۔

۳۔ مشرق نے جو ظالمانہ رائے عورتوں کے متعلق زمانہ جاہلیت میں قائم کی تھی اس وقت تک اس پر قائم ہے۔ مسلمان عام طور پر عورتوں کو ناقصات العقل والدین اور فتنہ وفساد کی جڑ سمجھتے ہیں۔ برخلاف اس کے یورپ عورتوں کو غیر معمولی عزت اور احترام دیتا ہے اور مردوں سے کسی امر میں کم نہیں سمجھتا۔

یہ تین باتیں وہ ہیں جو آج مصر و ہندوستان میں پردہ کا ہر مخالف زور شور سے پیش کرتا ہے بلکہ ان کی تشریح وتفسیر میں عجیب عجیب نکتہ آفرینیاں کی جاتی ہیں۔ اس لیے فرید وجدی نے "اَلمراۃ المُسلہ" میں ان ہی تینوں مسئلوں کو پیش نظر رکھا ہے اور ان کے متعدد ٹکڑے کر کے تیرہ فصلوں میں الگ الگ بحث کی ہے۔ ان فصلوں میں اہم مباحث یہ ہیں:

۱۔ عورت کیا ہے؟

۲۔ عورت کے قدرتی فرائض کیا ہیں؟

۳۔ کیا مرد اور عورت جسمانی طاقت میں مساوی ہیں؟

۴۔ کیا عورتیں عملی دنیا میں مردوں کے ساتھ شریک ہوسکتی ہیں؟

۵۔ کیا عورت کو مردوں سے پردہ کرنا چاہیے؟

۶۔ کیا پردہ عورتوں کے لیے غلامی کی علامت ہے اور آزادی کا منافی ہے؟

۷۔ کیا پردہ عورتوں کی ترقی و کمال میں مانع ہے؟

۸۔ کیا پردہ کا عالمی اثر زائل ہوسکتا ہے؟

۹۔ کیا موجودہ مادی مدنیت کی عورتیں کامل عورتیں ہیں؟

۱۰۔ مسلمان عورت کی تعلیم کا احسن طریقہ کیا ہے؟

ابوالکلام آزاد

☼☼☼

عورت کیا ہے؟... اور اس کے قدرتی فرائض کیا ہیں؟

قدرت نے مخلوقات کو مختلف جنسوں اور مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے اور ہر گروہ کے خاص خاص فرائض اور خاص خاص وظائف قرار دیے ہیں۔ ان تمام فرائض کی انجام دہی کے لیے چونکہ ایک ہی قسم کی جسمانی حالت اور دماغی قابلیت کافی نہ تھی۔ اس لیے جس گروہ کے سپرد جو کام کیا گیا اس کے موافق اس کو دماغی اور جسمانی قابلیت عطا کی گئی۔ فرائض کے اختلافات کے ساتھ ضروریات زندگی کا بھی مختلف ہونا ضروری تھا۔ اس لیے ہر گروہ کو اسی قسم کے داخلی اور خارجی اعضاء دیے گئے جس قسم کی ضرورتیں اس کو پیش آتی ہیں۔ عام حیوانات پر نظر ڈالو! اونٹ کی غذا جنگل کی خاردار گھاس ہے اس لیے اس کو ویسی ہی زبان اور اسی قسم کے دانت بخشے گئے جو ان تیز و سخت شاخوں کو آسانی سے چبا سکیں اور ان کی سختی کے متحمل ہونے کی طاقت رکھتے ہیں۔ شیر کی غذا دوسرے زندہ حیوان ہیں اس لیے اس کے پنجے نہایت تیز سخت اور ایسے خاردار بنائے گئے جن کا ایک ہی وار بھیڑ اور بکری کی ہلاکت کا باعث ہو سکتا ہے۔ انہی فرائض کی انجام دہی کا مجموعی نام تمدن یا نظام عالم ہے جب کوئی گروہ اپنے طبعی فرائض کو ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے تو نظام تمدن کی بنیادیں ہلنے لگتی ہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی طرف کلام الٰہی نے اشارہ کیا ہے:

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (۲۰:۵۰)

ہمارا خدا وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کا مکمل وجود عطا فرمایا پھر اسے اپنے فرائض بجالانے کی ہدایت کی۔

اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (۴۹:۵۴)

ہم نے ہر چیز کو ایک اندازہ خاص پر پیدا کیا۔

نیچرل فلاسفی کا یہ قول خلاق عالم کے ان ہی ارشادات کی تفسیر ہے کہ ''طبیعت اپنی حد سے کبھی نہیں بڑھتی۔''

بے شک انسان فطرتاً آزاد ہے اور یہ آزادی اس کے ہر ارادی اور غیر ارادی فعل سے ظاہر ہوتی ہے لیکن آزادی کو تسلیم کرتے ہوئے اس امر کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ انسان کا اپنے حقیقی فرائض کو ادا کرنا نظام تمدن کا اصلی عنصر ہے۔ انسان ان مختلف قوتوں کے مجموعے کا نام ہے اس میں بعض قوتیں اگر صفات حسنہ کی طرف آمادہ کرتی ہیں تو بعض قوتیں برائیوں کے لیے ترغیب دیتی ہیں۔ اس میں سینکڑوں خواہشیں اس قسم کی موجود ہیں جن کے اثرات میں محیط ہو کر وہ عقل وتمیز کھو بیٹھتا ہے۔ تعلیم اور سوسائٹی کا خارجی اثر بسا اوقات ان طبعی قوتوں کے اثرات کو قوی اور تیز کر کے اس پر اپنا تسلط قائم کر لیتا ہے کہ جمادات ونباتات کی طرح مجبور محض ہو کر ان ہی کے اشاروں پر چلتا ہے اور ان ہی کی تحریک پر کام کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں نہ اسے اپنے فرائض یاد رہتے ہیں نہ دوسروں کے حقوق کی کچھ پروا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تسلط سے نکلنے کے لیے علم وفضل کام آ سکتا ہے، نہ فلسفہ وعقلیات کی تعلیم کچھ مدد کر سکتی ہے۔ اس لیے تمدن اور مذہب نے انسان کی فطری آزادی کو ایک خاص حد میں مقید کر دیا ہے۔ ہر گروہ کے طبعی فرائض تشخیص کیے ہیں اور انہی فرائض کے میدان میں اسے محدود کر دیا ہے۔ ان فرائض کے لحاظ سے جس حد تک آزادی حاصل کرنے کا وہ مستحق ہے اسے بخشی ہے اور جو آزادی ان کے فرائض میں خلل انداز ہوتی تھی اسے قطعی جرم قرار دے دیا۔ اب اس اصول کو ذہن نشین کر کے عورتوں پر نظر ڈالو اور دیکھو کہ ان کے طبعی فرائض کیا ہیں۔ ان فرائض کے لحاظ سے وہ کس آزادی کی مستحق ہیں اور کون سی آزادی ان کو فرائض منصبی سے باز رکھ سکتی ہے۔

عورت کو قدرت نے جس غرض کے لیے مخلوق کیا ہے وہ غرض نوع انسانی کی تکثیر اور اس کی حفاظت وتربیت ہے۔ پس اس حقیقت سے اس کا قدرتی فرض یہ ہے کہ اس اہم فرض کی انجام دہی کے لیے ہمیشہ کوشش کرتی رہے۔ اس فرض کی انجام دہی کے لیے جن اعضاء اور اعضاء میں تناسب کی ضرورت تھی، قدرت نے اسے عطا کیے ہیں، جس طرح مردوں کی طاقت سے یہ امر بالکل باہر ہے کہ وہ عورت کے طبعی فرائض میں حصہ لیں۔ اسی طرح عورت کی طاقت سے بھی یہ امر

باہر ہے کہ وہ مردوں کے علمی وتمدنی مشاغل میں شریک ہو۔

نوع انسانی کی تکثیر اور حفاظت کے لیے قدرت نے مسلسل چار دور قرار دیئے ہیں۔(۱) حمل (۲) وضع (۳) رضاعت (۴) تربیت۔ان میں سے ہر ایک دور کا زمانہ عورت کی زندگی کا نہایت اہم اور دشوار زمانہ ہوتا ہے اور اس کی حفاظت اور صحت کے لیے خاص خاص احتیاطوں اور علاجوں کی ضرورت پڑتی ہے، جن میں اگر کسی قسم کی کمی کی جائے تو سخت خطروں اور شدید بیماریوں میں مبتلا ہونے کا خوف ہوتا ہے۔ عالموں کی کچھ خصوصیت نہیں جاہل شخص بھی اس امر کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ متاہل اور صاحب اولاد ہو کہ ان چار زمانوں اور بالخصوص ابتدائی تین زمانوں میں عورت کی زندگی کو کن کن خوفناک خطروں کا سامنا ہوتا ہے۔ کس طرح وہ بعض وقت اپنی زندگی سے مایوس ہو جاتی ہے اور کس طرح ان مصیبتوں سے سخت مشکلوں کے بعد نجات پاتی ہے۔علم طب کا بہت بڑا حصہ ان دوروں کے لوازم احتیاط اور قوانین صحت کے متعلق مباحث سے تعلق رکھتا ہے۔ قدیم وجدید زمانے کے سینکڑوں عالموں اور تجربہ کار ڈاکٹروں نے اپنی عمریں صرف کر کے اس مسئلہ کی مشکلات اور مصائب دور کرنے کے لیے کتابیں تصنیف کی ہیں۔جن کے مطالعہ سے ان چاروں دوروں کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔انسان کی جہالت کا اصلی مبداء ان ہی زمانوں کی بے احتیاطی ہے اور انسانی خوبیوں کا حقیقی سرچشمہ بھی ان ہی زمانوں کی حفاظت ہے۔

ا۔حمل

زمانہ حمل جس کی مدت عام طور پر نو ماہ قرار دی گئی ہے، عورت کے لیے ایک ایسا نازک زمانہ ہوتا ہے جس میں وہ گھر کے فرائض ادا کرنے کے قابل بھی نہیں ہوتی اس کی ہر معمولی سے معمولی حرکت کا اثر نہ صرف اس کی ذات تک محدود رہتا ہے بلکہ اس میں وہ نازک اور ضعیف وجود بھی شامل ہوتا ہے جس کی حفاظت اور تربیت قدرت نے اس کے سپرد کی ہے۔اس نو مہینے کے زمانے میں جنین پر مختلف دور طاری ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک دور کے خاص آثار اور علامات ہیں اور ہر علامت کے زمانہ میں خاص خاص احتیاطیں اور حفاظتیں ضروری ہیں۔

زمانہ حمل میں ماں کی حالت سے جنین اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ اس کے ضعف وقوت یا زندگی وموت کا دارومدار محض ماں کی احتیاط اور حفاظت پر ہوتا ہے۔

اطبائے جدید وقدیم کا قول ہے کہ زمانہ حمل میں عورت کو نہایت شدت کے ساتھ اپنے خیالات، مزاج اور افعال کی نگہداشت کرنی چاہیے ورنہ جس قسم کے حالات اس کو پیش آئیں گے جنین کی جسمانی اور دماغی حالت بھی اسی قسم کی ہوگی۔

یورپ کے سینکڑوں تجربوں سے بھی اس کی تصدیق ہوئی ہے۔ مختلف بچوں کی عادات واطوار اور جسمانی قوت کے مبداء کا جب سراغ لگایا گیا، تو زمانہ حمل کے حالات ثابت ہوئے۔ فرانس میں خوبصورت والدین کا بچہ جب سیاہ رنگ اور حبشیوں کی سی صورت پر پیدا ہوا تو ڈاکٹروں کو اس اختلاف پر سخت حیرت ہوئی۔ تحقیق سے ثابت ہوا کہ زمانہ حمل میں ماں کی نشست کے سامنے میز پر ایک حبشی کا اسٹیچو رہا کرتا تھا جس کی سیاہی اور رنگ کا اثر نگاہوں کے ذریعہ دماغ میں پہنچا اور ذہن کو اس طرف غیر معمولی توجہ ہوگئی۔ اس کا نتیجہ ہے کہ بچے کو والدین کی صورت سے کوئی تعلق نہ رہا اور وہ حبشی کے ڈیل ڈول پر پیدا ہوا۔[1]

۲۔ وضع حمل

وضع حمل زمانہ حمل سے زیادہ سخت اور صعب ہوتا ہے، جس میں عورت کی زندگی موت سے نہایت قریب ہو جاتی ہے۔ وضع حمل کے بعد عورت نہایت سخت بیماری اور حقیقی ضعف میں مبتلا ہو جاتی ہے جس کا اثر مدت تک زائل نہیں ہوتا اور صحت کے بعد عورت کی زندگی از سرنو شروع ہوتی ہے۔ اطباء نے نہایت ضخیم ضخیم کتابیں اس وقت کے قواعد صحت اور قوانین احتیاط پر تصنیف کی ہیں اور وہ علاج بتائے ہیں، جن سے ان مختلف اقسام کے بخاروں سے حفاظت ہوسکتی ہے جو بسا اوقات عورت کے لیے باعث موت ہو جاتے ہیں۔

یہ وقت عورت کے لیے جس قدر نازک اور سخت ہے اس کا متقابل شخص اندازہ کرسکتا ہے۔ ہر سال دنیا میں ہزاروں جانیں صرف اس لیے ضائع ہو جاتی ہیں کہ قوانین طبیہ کے مطابق وضع حمل کے وقت احتیاط اور حفاظت نہیں کی جاتی۔

۳۔ رضاعت

تیسرا دور رضاعت کا زمانہ ہے۔ یہ زمانہ اگرچہ ماں کے لیے اس درجہ سخت اور دشوار نہیں جس قدر ابتدائی دور ہوتے ہیں لیکن بچے کے لیے سب سے زیادہ خطرناک اور غیر معمولی توجہ کا محتاج ہوتا ہے۔ اس زمانہ کی حفاظت کے لیے خاص قواعد اور قوانین ہیں جن کی تعمیل میں اگر کسی قسم کی کوتاہی ہوتی ہے تو بچہ کی جان یا تو خطرہ میں پڑ جاتی ہے یا ہمیشہ کے لیے کوئی جسمانی اور دماغی نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ ایام رضاعت میں ماں کی احتیاط اور قواعد طبی پر عمل اس لیے ضروری ہے کہ جس قسم کی غذا اس کے استعمال میں آتی ہے اسی قسم کا اثر بچہ پر مرتب ہو جاتا ہے۔ اگر ماں گرم غذا (اعتدال اور قاعدے سے) زیادہ استعمال کرتی ہے تو اس کا مضر اثر جس طرح خود ماں پر پڑتا ہے اسی طرح بچہ بھی متاثر ہوتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض بچے نہایت سخت بیماریوں میں اس لیے مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ایام رضاعت میں ماں بے احتیاطی سے بعض مولد امراض چیزوں کا استعمال کر لیتی ہے۔ ان کا مضر اثر دودھ کے ذریعے سے بچہ تک پہنچتا ہے اور مختلف امراض کا باعث ہوتا ہے۔

علاوہ اس کے بچے کی جسمانی شگفتگی اور دماغی صحت اس پر موقوف ہے کہ یوم ولادت سے آخر ایام رضاعت تک غذا میں، لباس میں اور صفائی میں کسی قسم کی بے احتیاطی نہ کی جائے اور ایک لحظہ بھی بچہ پر ایسا نہ گزرے کہ ماں اس کی حالت سے غافل ہو۔ ہمارے ملکوں میں ہزاروں بچے نشوونما پانے سے پہلے اس دنیا سے منہ موڑ لیتے ہیں کیونکہ ان کی مائیں ان ضروری قواعد سے ناواقف اور بے خبر ہوتی ہیں۔

۴۔ تربیت

چوتھا دور زمانہ تربیت ہے اور درحقیقت بلحاظ اہمیت کے اور بلحاظ ان اثرات کے جن پر انسان کی تمام آئندہ خوبیاں منحصر ہیں پہلے تینوں دوروں سے زیادہ خطرناک اور بہت زیادہ قابل توجہ ہے۔

بچہ جب عالم غیب سے یکایک دنیا میں قدم رکھتا ہے تو ایک ایسے آئینہ کی طرح ہوتا ہے جس کی سطح بالکل صاف اور ہر قسم کے اثرات قبول کرنے پر آمادہ ہوتی ہے، نہ کسی کا عکس اس میں نظر آتا ہے اور نہ کسی قسم کی تصویر اس پر منقش ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں جس قسم کا اثر اس پر ڈالا جاتا ہے۔ ہمیشہ کے لیے قائم ہو جاتا ہے۔ اگر خوشنما نقش و نگار سے اس کی سطح مزین کی گئی، تو ہمیشہ کے لیے وہ آئینہ خوبصورت ہو گیا۔ اگر بدقسمتی سے کسی ناواقف اور جاہل نے ٹیڑھی سیدھی لکیریں کھینچ دیں تو ہمیشہ کے لیے بدنما ہو گیا۔ اس کی صاف اور شفاف سطح سیاہ و سفید سے محض بے خبر ہوتی ہے اس لیے اس کو کسی رنگ کے قبول کرنے میں انکار نہیں ہوتا اور جس مصور کے ہاتھ قدرت نے اسے سپرد کیا ہے اس کی ہر رائے کے آگے سر تسلیم جھکا دیتی ہے۔

یہی حال اس تازہ وارد مسافر کا ہوتا ہے جس کے لیے دنیا اور دنیا کی ہر بات بالکل نئی ہوتی ہے۔ اس کے کان جس طرح فضائل انسانی سے ناآشنا ہوتے ہیں اسی طرح رذائل انسانی سے بے خبر ہوتے ہیں۔ وہ نہیں جانتا کہ رحم کیا چیز ہے اور ظلم کس کو کہتے ہیں۔ نہ اس کو اس کی خبر ہوتی ہے کہ علم انسانی خوبیوں کا سرچشمہ ہے اور جہل تمام برائیوں کا مخزن ہے۔ اس کا سادہ ذہن آئینہ کی طرح ہر قسم کے نقش و نگار سے خالی ہوتا ہے مگر ہر اثر کے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کی شفیق ماں اس کی فطری مصور ہوتی ہے جس کی توجہ اور تربیت یا تو اخلاقی محاسن کا نقش اس کے دماغ پر کالحجر کر دیتی ہے۔ یا تمام رذائل انسانی کا عادی بنا کر نہ صرف اس کی بلکہ سوسائٹی کے ہر فرد کی زندگی ہمیشہ کے لیے تلخ کر دیتی ہے۔ اسی زمانہ کے وہ اثرات انسان کی طبیعت ثانیہ ہو جاتے ہیں جن کو نہ اعلیٰ تعلیم یافتہ کا اثر زائل کر سکتا ہے، نہ ساری عمر کی جدوجہد اور کوشش کھو سکتی ہے۔ قوموں کی ترقی کا بڑا راز تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ کسی قوم کے افراد کی یہی ابتدائی تربیت ہے، جو انسان اپنی زندگی

کے ابتدائی حصہ میں صرف ماں کی کوشش اور توجہ سے حاصل کر سکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جس گروہ کا قدرتی فرض ایسے اہم اور دشوار مرحلوں کا طے کرنا ہے کیا وہ دنیا کی تمدنی کشمکش میں شریک ہو سکتا ہے؟ اور کیا اس قسم کی شرکت اس کے طبعی فرائض میں حارج نہ ہو گی؟ فرض کرو کہ ایک عورت علم و تدبر کے اعلیٰ درجہ تک ترقی کر کے کسی پارلیمنٹ میں ممبر یا کسی سیاسی گروہ کی ایک رکن ہو گئی ہے لیکن ساتھ ہی تاہل اور معاشرت کے طبعی نتائج نے اس کو زمانہ حمل کی صعوبات میں بھی مبتلا کر دیا ہے تو ایسی حالت میں وہ اپنی پارٹی کی حمایت اور سیاسی مناقشات کے فیصل کی تدابیر پر غور کرے گی اور شب و روز اسی فکر میں سرگرم رہے گی۔ یا ان تدابیر صحت اور قوانین احتیاط پر عمل کرے گی جن کی تعمیل میں ذرا سی کمی اس کی اور جنین کی ہلاکت کا باعث ہو جاتی ہے اس کا قدرتی فرض تو یہ ہے کہ اس دور کا تمام زمانہ ان افکار و اعمال میں گزار دے جن کا اثر جنین کی جسمانی و دماغی ساخت کے لیے مفید ہو لیکن سیاسی ضرورتیں اس کو مجبور کرتی ہیں کہ پریشان کن اور نہایت تلخ و ناگوار افکار میں مبتلا ہو کر سخت بے چینی اور بے اطمینانی میں یہ زمانہ صرف کر دے تو کیا ایسی حالت میں یہ شرکت اس کے قدرتی فرض میں خلل انداز نہ ہو گی؟ اور کیا اس کی صحت کے لیے مضر نہ ہو گی؟ اس مثال پر موقوف نہیں، فرض کرو ایک عورت نے قانونی تعلیم کو بدرجہ کمال حاصل کر کے ایک کامیاب بیرسٹر کی صورت میں اپنے آپ کو پبلک پر ظاہر کیا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی گود میں ایک ننھا سا وجود بھی اس کی توجہ اور محبت کے انتظار میں اس کی صورت کو تک رہا ہے۔ ایسی حالت میں اس کا کسی جرم کی مدافعت میں اور ان قانونی پہلوؤں کی تلاش میں جو اس کے موکل کے لیے مفید ہوں، مصروف رہنا اور شب بھر سندوں اور حوالوں کی جستجو میں قانون کی ضخیم کتابوں کی ورق گردانی میں منہمک رہنا کہ صبح کو مقدمہ کی پیشی ہونے والی ہے کیا اس کو ایام رضاعت کے نازک فرائض سے باز نہ رکھے گا؟ اور کیا اپنی پوری توجہ اور قوت جرم کی مدافعت کی کامیابی کے لیے صرف کر دینا اور اسی فکر و کوشش میں رہنا اس کو بچہ کی نگہداشت اور تربیت سے غافل رہنے پر مجبور نہ کرے گا؟ عورت کے طبعی فرائض کی ہدایت تو یہ ہے کہ یوم ولادت سے لے کر آخر ایام طفولیت تک بچے کی ہر حرکت اور ہر فعل

کی نگہداشت کرے، عمدہ خصائل کا اسے عادی بنائے، بری عادتوں سے محفوظ رکھے لیکن اس بدقسمت بچہ کا کیا حال ہوگا جب اس کی بیرسٹر ماں عدالت میں فریق مخالف پر جرح کر رہی ہوگی اور اس کا شیر خوار بچہ اس کی توجہ اور تربیت کا منتظر جھولے میں پڑا ہوگا؟ یا اس بدنصیب بچہ کی صحت اور زندگی کس حالت میں ہوگی جب وہ صالح اور مفید دودھ کا محتاج ہوگا اور اس کی مدبر پارلیمنٹ کی ممبر ماں ''لبرل پارٹی'' کی حمایت کے خیال میں رات دن مستغرق اور اس کی کامیابی کی مختلف جدوجہد میں منہمک ہوگی؟ اور ناکامی کے انفعال وافسوس نے دودھ میں فساد پیدا کر کے بچہ کی طبعی غذا کو اس کے لیے مضر اور خطرناک بنا دیا ہوگا؟ کیا یہ اور اسی قسم کی اور مثالیں اس امر کے سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہیں کہ قدرت نے عورت کو مردوں کے مشاغل سے الگ رکھا ہے اور اس کے طبعی فرائض اس قدر مصروفیت طلب اور محتاج توجہ ہیں کہ عورت کا مردوں کے ساتھ شریک ہونا بغیر اس کے محال ہے کہ وہ طبعی فرائض کی ادائیگی سے بے خبر یا دست بردار ہو جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ قدرت نے دنیا کے کاموں کے خود ہی دو حصے کر دیے ہیں۔ نوع انسانی کی حفاظت اور تکثیر اور انسانی ضروریات کا انتظام۔ پہلا کام عورت کے ذمہ قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے اس کو اسی قسم کے اعضاء اور اسی قسم کی جسمانی قوت دی گئی جو اس فرض کی انجام دہی کے لیے ضروری ہیں۔ دوسرا کام مرد کے متعلق کیا گیا۔ اس لیے اسی کے مطابق جسمی اور دماغی طاقت عطا کی گئی۔ ان دونوں گروہوں کا الگ الگ کام دنیا کا مجموعی تمدن قائم رکھتا ہے اور جب اختلاف کے اٹھانے کی کوشش ہوتی ہے یا کوئی گروہ اپنے فرائض سے باہر قدم نکالتا ہے تو تمدن اور معاشرت کے انتظام میں خلل پڑ کر سینکڑوں دقتیں اور مشکلیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لیے عورت کے طبعی فرائض کا اقتضاء اس خیال کا بالکل مخالف ہے کہ اس کو مردوں کے فرائض میں شریک کیا جائے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جہاں بھی اس خیال کی تائید کی گئی معاشرت اور تمدن کے میدان میں ہزاروں خرابیاں پیدا ہو گئیں کیونکہ یہ قدرت کا قانون ہے اور اس کے خلاف کوئی مصنوعی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔

پس ہمارا فرض یہ ہونا چاہیے کہ ہم ہمیشہ کوشش کرتے رہیں کہ عورت اپنے طبعی فرائض کے میدان میں محدود رہے اور ان فرائض کو قدرت کی ہدایت کے مطابق انجام دے اور اگر ہم دیکھیں کہ عورت اپنے طبعی فرائض سے دور ہو رہی ہے تو اس کو ایک تمدنی مرض سمجھیں اور اس کے علاج کے لیے

جدوجہد کریں کیونکہ عورت اگر فلسفہ وعلوم کے ہزار مرحلے طے کر لے مگر اپنے طبعی وظیفہ سے غافل رہے تو ناممکن ہے کہ وہ علم وفضل اس کے لیے یا سوسائٹی کے لیے مفید ہو سکے۔

عورتوں کی آزادی کے متعلق پہلا اعتراض یہ کیا جاتا ہے:

انسان فطرتاً آزاد ہے پھر وہ کون سا معیار ہے جس کی بناء پر عورتیں اس آزادی سے محروم رکھی جاتی ہیں؟ اس اعتراض میں یہ امر تسلیم کر لیا گیا کہ عورتیں آزادی سے محروم ہیں لیکن جب سوال کیا جاتا ہے کہ کیونکر؟ تو جواب میں دو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ عورتوں کو تعلیم نہیں دی جاتی۔ دنیا کے عام تمدنی اور سیاسی مشاغل میں شریک نہیں کیا جاتا۔

۲۔ ان کو پردہ میں تقید کے ساتھ رکھا جاتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مردوں کی طرح آزاد نہیں ہیں۔

قاسم امین بک نے بھی ان ہی دو دلیلوں پر زور دیا ہے اور مختلف واقعات پیش کر کے ثابت کر دیا ہے کہ پردہ میں عورتوں کو مقید رکھنا اور مردوں کی طرح عام تمدنی مشاغل میں شریک نہ ہونے دینا عورتوں کی غلامی اور فطری آزادی سے محرومی کا ثبوت ہے۔[۲]

ہم نے اس کے جواب میں دور از کار بحثوں سے چشم پوشی کر کے صرف عورتوں کے طبعی فرائض پیش کر دیئے ہیں جن کو قارئین پہلی فصل میں پڑھ آئے ہیں۔ اس کی روشنی میں غور کیا جائے۔ قارئین کہ قاسم امین بک کا خیال کہاں تک صحیح ہے؟ پہلی دلیل کا جواب ظاہر ہے کہ جس گروہ کے طبعی فرائض ایسے اہم اور دشوار ہوں، کیا وہ مردوں کی طرح عام تعلیم حاصل کر کے دنیا کی تمدنی اور سیاسی کشمکش میں شریک ہو سکتا ہے؟ عورتوں کو مردوں کے جبر نے ان مشاغل سے دور نہیں رکھا بلکہ خود فطرت نے مردوں کی دنیا سے عورتوں کو الگ کر دیا ہے۔ اس لیے اعتراض قدرت پر ہونا چاہیے نہ کہ مردوں پر۔

پردہ کی بحث مستقل عنوان سے آگے آئے گی لیکن عورتوں کے طبعی فرائض پر نظر کرتے ہوئے کیا اس امر کے تسلیم کرنے میں کوئی عذر ہو سکتا ہے کہ مردوں کی نسبت عورتوں کو ایک خاص حد تک تقید میں رہنا چاہیے۔ قدرت نے ہر گروہ کے فرائض مقرر کر دیئے ہیں اور اقتضائے فرائض کے لحاظ سے ایک خاص حد تک مقید بھی کر دیا ہے۔ مذہب اور تمدن کا دنیا میں یہی کام ہے۔ اس بناء پر اگر عورتوں کی آزادی کو کسی

معتدل حد تک مقید نہ کیا جائے تو طبعی فرائض کی انجام دہی میں سخت خرابیاں پیدا ہو جائیں۔

عورتیں اور مرد دو مختلف گروہ ہیں اس لیے ان دونوں کے میدان عمل کو الگ الگ کر کے پردہ کو بیچ میں حد فاصل قرار دیا گیا تا کہ ہر گروہ اپنے میدان عمل میں محدود رہے۔ اس حد فاصل کے اٹھانے کی جب بھی کوئی کوشش کی جاتی ہے تو تمدن و معاشرت کی بنیادوں میں حرکت پیدا ہو کر دنیا کو خبردار کر دیتی ہے کہ عنقریب عمارت گرنے والی ہے۔ اس امر کے ثبوت کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ یورپ کی موجودہ حالت کافی ہے۔

قاسم امین بک نے آزادی کی تعریف ان جملوں میں کی ہے:

"آزادی سے ہماری غرض یہ ہے کہ مذہب اور تمدن نے جو حدود قائم کر دیئے ہیں ان سے واقف ہونے کے بعد انسان اپنے خیالات، اعمال اور ارادے میں مستقل بالذات ہے۔"

جب مذہب اور تمدن کی قید ضروری اور مسلم ہے تو ناظرین اس امر کا فیصلہ آسانی سے کر سکتے ہیں کہ کیا عورتوں کا طبعی وظیفہ اس امر کا متقاضی ہے کہ ان کو مردوں کے تمدن اور سیاسی مشاغل میں شریک کیا جائے؟ اور کیا مذہب اور تمدن کے مصالح اقتضائے فرائض کے لحاظ سے عورتوں کو ایک خاص حد تک مقید رکھنا ضروری نہیں قرار دیتے؟ یورپ کے مشہور مصنفوں کے جو اقوال تیسری فصل میں درج کیے جائیں گے ان کے دیکھنے کے بعد تم خود اندازہ کر لو گے کہ یہ صرف ہماری ہی رائے نہیں ہے بلکہ یورپ کے تمام چیدہ مصنفین اس مسئلہ میں ہمارے ہم زبان ہیں۔ ان کی متفقہ آواز پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ:

"عورتوں کا طبعی فرض نوع انسان کی حفاظت اور تربیت ہے، اس دائرے سے عورت جب باہر قدم نکالتی ہے تو عورت نہیں رہتی بلکہ عورت اور مرد کے علاوہ ایک تیسری جنس کا نمونہ بن جاتی ہے۔"

یورپ کے یہ مصنفین وہاں کی عورتوں کو عورت تسلیم کرنے میں تامل ظاہر کرتے ہیں اور آزادی کی خواہش کو ایک خالص خبط اور نرمی وحشت قرار دیتے ہیں۔

❋❋❋

کیا مرد اور عورت
جسمانی اور دماغی قوت میں برابر ہیں؟

سر قضا کہ در تحقیق غیب منزلیست
مستانہ اش نقاب ز رخسارہ برکشیم

جب ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ میں عورتیں اس کوشش میں مصروف ہیں کہ مردوں کے تسلط سے نکل کر بالکل آزاد ہو جائیں اور اپنے آپ کو جسماً اور عقلاً ان کے برابر ثابت کر دیں تو ہمیں سخت افسوس ہوتا ہے اور افسوس اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ خیال مضر اور ناقص تعلیم کے ذریعہ مغرب سے مشرق کی طرف قدم بڑھا رہا ہے اور بعض نادان اور سادہ لوح اس کی ظاہری صورت کی مصنوعی و دلفریبی پر شیفتہ و فریفتہ ہو کر اس کے خیر مقدم کا سامان کر رہے ہیں۔ اس لیے ہم اس فصل میں علمی دلائل پیش کر کے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ عورتوں کی مفروضہ آزادی کا خیال اور خبط محالات کے اقسام میں سے ایک قسم ہے جس کی طرف اسی شخص کا ذہن منتقل ہو سکتا ہے جو حواس کی دولت برباد کر چکا ہو اور دیوانگی اور جنون کے دیو کا رعب اس کے دماغ کو معطل کر چکا ہو۔ ہم یورپ کے مشاہیر عقلاء اور سر برآوردہ علماء کی سائنٹیفک آراء نقل کر کے بتلانا چاہتے ہیں کہ جو شخص اس خیال کی کامیابی کے لیے کوشش کرتا ہے اس کی مثال بعینہ اس مجنون کی سی ہے جس کے سر میں قوانین قدرت کے تغیر و تبدل کا سودا سا جائے اور وہ اپنی قیمتی جدوجہد اور کوشش اس انہونی اور عبث بات کے لیے صرف کر دے۔

قاسم امین بک نے المراۃ الجدیدہ میں جا بجا اس امر پر زور دیا ہے کہ:

''یورپ نے غفلت کے اس قدیم پردے کو اپنی علمی تحقیقات سے چاک کر دیا ہے جس نے اس وقت تک عورتوں کی اصلی حالت کو پوشیدہ رکھا ہوا تھا۔''

علم تشریح اور فزیالوجی کی تحقیقات اور تجارب نے ثابت کر دیا ہے کہ مردوں اور عورتوں میں کسی قسم کا جسمانی یا دماغی فرق نہیں ہے اور جو علمی کام مرد کے قوائے ذہنی انجام دے سکتے ہیں بعینہٖ اسی طرح ایک عورت بھی انجام دے سکتی ہے۔

صرف قاسم امین بک ہی کا یہ دعویٰ نہیں ہے بلکہ جب کبھی عورتوں کی آزادی کا مسئلہ پیش ہوتا ہے تو فریق مخالف کی طرف سے عموماً یہی دعویٰ پرزور الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے ہمارا ایک اہم فرض یہ بھی ہے کہ اس دعویٰ کی صداقت یا عدم صداقت کا قطعی فیصلہ کر دیں۔

قاسم امین بک نے اس دعویٰ کے ثبوت میں صرف دو قول پیش کیے ہیں چنانچہ وہ لکھتا ہے:

''ہمارے اس دعویٰ کی تصدیق پروفیسر فرش لو اور مے رتن جاوز جیسے علماء کے اقوال سے ہو سکتی ہے۔ آخر الذکر محقق فزیالوجی کا پروفیسر اور اٹلی اکادمی کا ممبر ہے۔''

فرش لو لکھتا ہے کہ:

''میں نے ایک عرصہ تک علم ریاضی، اخلاق اور فلسفہ کی تعلیم دی ہے۔ میرے شاگردوں میں ایک بڑی تعداد عورتوں کی بھی تھی مگر میں نے تعلیمی ترقی کے لحاظ سے عورتوں میں کسی قسم کا دماغی ضعف نہیں پایا اور مجھ پر ہمیشہ یہی ثابت ہوا کہ مرد اور عورت کے دماغی قویٰ میں ذرہ بھر فرق نہیں ہے۔''

مے رتن جاوز اپنی کتاب ''عورتوں کی فزیالوجی'' میں لکھتا ہے کہ:

''تشریحی تحقیقات کی رو سے عورت اور مرد میں کسی قسم کا فرق ثابت نہیں ہوتا۔''

پھر ان دو آراء کی بناء پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ:

''علم فزیالوجی کے وہ مشہور اور باعظمت علماء جو نہایت باریک نگاہ عورتوں کی جسمانی اور دماغی حالت پر رکھتے ہیں، اس امر پر متفق ہیں کہ عورت تمام قوائے عقلیہ میں مرد کے برابر درجہ رکھتی ہے۔''

ان اقوال اور دعاوی کو دیکھ کر ہر شخص یہی رائے قائم کرے گا کہ یورپ کے مشاہیر علماء

عورت کو مرد سے کسی بات میں کم نہیں سمجھتے اور قوائے عقلیہ کے لحاظ سے دونوں کو ایک درجے میں رکھتے ہیں مگر درحقیقت یہی وہ دھوکہ ہے جس میں ہندوستان کی ہرنئی جماعت مبتلا ہے اور جس کی وجہ کوتاہ نظری اور معلومات کی کمی ہے۔ اگر ان دو آراء کے مقابلہ میں یورپ کے محقق علماء کی رائیں دیکھی جائیں تو معلوم ہو جائے کہ یورپ کا فاضل ترین حصہ ہرگز اس خیال کو تسلیم نہیں کرتا۔ ہم ان دو قولوں کے مقابلہ میں بیسیوں اقوال پیش کریں گے اور ان لوگوں کے جو آج یورپ میں موجودہ مدنیت کے مجدد، بہترین مصنف اور فلسفہ حسی کے جلیل القدر عالم تسلیم کیے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے عورت کے جسمانی ضعف پر نظر ڈالو اور غور سے دیکھو کہ قاسم امین بک اور اس کے ہم خیال لوگوں کا دعویٰ مساوات کہاں تک صحیح ہے؟

عورت کا جسمانی ضعف

۱۔ علم تشریح کی تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ مرد کی جسمانی حالت عورت کی نسبت بہت زیادہ قوی ہے۔ یہ جسمانی اختلاف محض قیاس اور ظن پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس یقینی درجہ تک پہنچ چکا ہے کہ جس کو تسلیم نہ کرنا مشاہدات اور محسوسات کا انکار کرنا ہے۔ اس جسمانی اختلاف کی بناء پر یورپ میں بعض علمائے تشریح عورت کو موجودہ زمانے کے ترقی یافتہ مرد کا حقیقی مقابل تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ عورت اس قدیم مخلوق کی یادگار ہے جو ترکیب جسمانی اور خلقی کمزوری میں اس کے مشابہ تھا اور اس کے قوائے جسمانی و عقلی اپنے اصلی درجہ تک نہیں پہنچے تھے۔ انسان کی مزاحمت نے اس مخلوق کو فنا کر دیا اور اس کی عورتوں پر قبضہ کر لیا۔ اسی کی نسل سے موجودہ دور کی عورتیں پیدا ہوئیں۔ (انسائیکلوپیڈیا لفظ ''عورت'')

۲۔ انیسویں صدی کے انسائیکلوپیڈیا کا مصنف لفظ ''عورت'' پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''مرد و عورت میں اعضائے تناسل کی ترکیب و صورت کا اختلاف اگرچہ ایک بڑا اختلاف نظر آتا

ہے لیکن صرف یہی ایک اختلاف نہیں ہے۔ عورت کے اور تمام اعضاء سر سے پیر تک مرد کے اعضاء سے مختلف ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اعضاء بھی جو بظاہر مرد سے بے حد مشابہ نظر آتے ہیں۔"

پھر علم تشریح کی تحقیقات کے موافق عورتوں کے اعضاء پر نہایت دقیق بحث کی ہے اور تمام بحث کا آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے:

"درحقیقت عورت کی جسمانی ترکیب قریب قریب بچے کی جسمانی ترکیب کے مشابہ ہے۔ اسی لیے تم دیکھتے ہو کہ بچے کی طرح عورت کا بھی حاسہ ہر قسم کے اثر سے بہت بہت جلد اور بہت زیادہ متاثر ہو جاتا ہے۔ بچے کا قاعدہ ہے کہ اگر کوئی رنج اور افسوس کا واقعہ پیش آئے تو فوراً رونے لگتا ہے اور اگر کوئی خوشی کی بات ہو تو بے اختیار ہو کر اچھلنے کودنے لگتا ہے۔ قریب قریب یہی حال عورت کا ہے کہ بہ نسبت مرد کے بہت زیادہ اس قسم کے جذبات سے متاثر ہوتی ہے کیونکہ یہ موثرات اس کے تصور پر اس طرح اثر ڈالتے ہیں کہ عقل کو ان سے لگاؤ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں استقلال نہیں ہوتا اور اسی لیے سخت اور خوفناک موقعوں پر عورت ثابت قدم نہیں رہ سکتی۔"

۳۔ علمی تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے قد کا اوسط طول مرد کے قد کی اوسط درازی سے بارہ سنٹی میٹر کم ہے۔ یہ فرق کسی خاص ملک یا قوم سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ جس طرح وحشی اقوام میں پایا جاتا ہے اسی طرح متمدن ممالک میں بھی پایا جاتا ہے اور جوانوں کی طرح بچے بھی اس اختلاف کی شہادت دیتے ہیں۔

۴۔ جس طرح عمر کے اوسط میں فرق پایا جاتا ہے اسی طرح جسم کے وزن اور ثقل میں بھی اختلاف ہے۔ مرد کے جسم کا متوسط ثقل سنتالیس (۴۷) کلو ہے مگر عورت کے جسم کا ثقل مرد کے ثقل سے پانچ کلو کم ہوتا ہے۔

۵۔ عضلات کے حجم وقوت کے لحاظ سے بھی عورت مرد کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

ڈاکٹر فارینی "انسائیکلوپیڈیا" میں لکھتا ہے کہ:

"مجموعی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو عورت کے جسم کے عضلات مرد کے عضلات سے اس قدر ضعیف ہیں کہ اگر ان کی طبعی قوت کے تین حصے کیے جائیں تو دو حصے قوت مرد کے حصے میں آئے گی اور صرف ایک حصہ قوت عورت میں ثابت ہو گی۔ عضلات کی حرکت کی سرعت

اور ضبط کا بھی یہی حال ہے۔ مرد کے عضلات جسمی عورت کی نسبت حرکت میں زیادہ تیز اور اپنے فعل میں زیادہ قوی ہیں۔"

۶۔ قلب جو انسانی زندگی کا اصلی مرکز ہے اس میں بھی یہی اختلاف پایا جاتا ہے۔ علمی تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ عورت کا قلب مرد کے قلب سے ساٹھ ڈرام چھوٹا اور خفیف ہوتا ہے۔

۷۔ سرعت تنفس کے لحاظ سے بھی عورت اور مرد میں عظیم الشان اختلاف ہے۔ علمی تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ سانس کے ذریعے سے کاربولک ایسڈ کے جو ذرات باہر آتے ہیں وہ اندرونی حرارت کی گرمی سے بخارات بن کر سانس میں ملے ہوئے نکلتے ہیں۔ اس تجربے کی بناء پر تحقیق کیا گیا تو معلوم ہوا کہ مرد ایک گھنٹہ میں تقریباً گیارہ ڈرام کاربون کی مقدار جلا دیتا ہے مگر عورت چھ ڈرام سے کچھ زائد جلاتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت کی حرارت غریزی بھی مرد کے مقابلہ میں کم یا نصف سے کچھ زائد ہے۔

عورت کا دماغی ضعف

یہ تمام تحقیقات اور عورت کے جسمانی ضعف کو کن قطعی دلیلوں سے ثابت کرتے ہیں اور قاسم امین بک کے دعویٰ مساوات پر کس قسم کا اثر ڈالتے ہیں؟ اس کا فیصلہ ناظرین کے طبع سلیم پر چھوڑ کر اب ہم اس مسئلہ کے دوسرے پہلو پر متوجہ ہوتے ہیں اور عورت اور مرد کا معنوی اختلاف اور اول الذکر کا دماغی ضعف وضاحت کے ساتھ دکھلاتے ہیں۔

ا۔ مشہور نہلسٹ فلاسفر علامہ پرودن اپنی کتاب "ابتکار النظام" میں لکھتا ہے:

"عورت کا وجدان بمقابلہ مرد کے وجدان کے اسی قدر ضعیف ہے جس قدر اس کی عقلی قوت مرد کی عقلی قوت کے مقابلہ میں ضعیف نظر آتی ہے۔ اس کی اخلاقی قوت بھی مرد کے اخلاق سے بالکل مختلف ہے اور دوسری قسم کی طبیعت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس چیز کے حسن وقبح کے متعلق وہ رائے قائم کرتی ہے مردوں کی رائے سے مطابقت نہیں رکھتی۔ پس عورت اور مرد میں عدم مساوات کوئی عارضی امر نہیں ہے بلکہ عورت کی طبعی خاصیت پر مبنی ہے۔"

۲۔ حواس خمسہ

جس پر انسان کی عقل اور دماغی نشو ونما کا دارومدار ہے اس میں بھی سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔
علامہ نیکولس اور علامہ بیلی نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے حواس خمسہ مرد کے حواس سے ضعیف تر ہیں۔
(الف) عورت کی قوت شامہ کی طاقت سے یہ امر باہر ہے کہ وہ ایک خاص فاصلہ سے عطر لیموں کی خوشبو محسوس کر سکے۔ برخلاف مرد کے کہ اس کی قوت شامہ اس قدر قوی ہے کہ وہ اس درجہ کی خوشبو کو آسانی سے محسوس کر لیتا ہے جس مقدار کی خوشبو سے عورت کو احساس ہو سکتا ہے۔
(ب) اسی طرح تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ عورت ہلکے براسک ایسڈ کی بو......۲/۱ کی نسبت سے اور مرد......۱/۱ سے محسوس کر سکتا ہے جو ضعف کی بین دلیل ہے۔
(ج) ذوق اور سمع کا حاسہ بھی عورت سے مرد کا بہت زیادہ قوی ہے۔ اس کے لیے تشریحی دلیل کی ضرورت نہیں انسائیکلو پیڈیا نے تصریح کر دی ہے کہ:

''اسی ضعف کا نتیجہ ہے کہ طعام کی عمدگی اور بدمزگی پہچاننے والے، آواز کے پرکھنے والے اور پیانوں کے راگوں کے نقاد کل کے کل مرد ہیں۔ ایک عورت نے بھی خود کو ان باتوں میں باکمال ثابت نہیں کیا۔''

(د) قوت لامسہ کے متعلق علامہ لومبروزر اور سیرجی جیسے استادوں کی متفقہ تحقیق ہے کہ عورت میں یہ قوت مرد کی نسبت بہت ضعیف پائی جاتی ہے۔ ان کی محققانہ دلیل یہ ہے کہ جن آلام اور تکالیف کی جس قدر متحمل عورت ہوتی ہے مرد اس قدر نہیں ہو سکتا۔ یہ ظاہر فرق بتلا رہا ہے کہ مرد کی نسبت عورت کی قوت احساس ضعیف بلکہ ضعیف تر ہے۔ علامہ لومبروزر کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

''حمل اور وضع حمل کی شدید تکالیف پر نظر ڈالو اور دیکھو کہ عورت دنیا میں کیسے کیسے آلام و مصائب کی متحمل ہو سکتی ہے۔ اگر مرد کی طرح اس کا احساس قوی ہوتا تو وہ ان تمام سختیوں کی

کیونکر متحمل ہو سکتی تھی۔ درحقیقت نوع انسان کی یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ قدرت نے اس کو قوی احساس سے محروم رکھا ہے ورنہ بنی نوع انسان کے نازک اور تکلیف دہ فرائض کی انجام دہی ایک غیر ممکن بات ہو جاتی۔"

قوت ادراک کا اصلی مرکز انسانی ''بھیجا'' ہے، اس کی کمی وزیادتی اور ضعف وقوت پر ادراک کی تیزی اور سستی کا دارومدار ہے لیکن جب علم سائیکولوجی[2] کے تجارب کو پیش نظر رکھ کر ہم غور کرتے ہیں تو اس میں بھی عورت ضعیف تر ثابت ہوتی ہے۔ علم مذکور نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے بھیجے اور مرد کے بھیجے میں شکلاً بھی سخت اختلاف ہے۔ مرد کے بھیجے کے وزن کا اوسط عورت کے بھیجے سے سوڈرام زیادہ ہے۔[3] اگر کوئی اس کے جواب میں کہے کہ یہ زیادتی عورت اور مرد کے جسمانی اختلاف پر مبنی ہے تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ تحقیق ہو چکا ہے کہ مرد کے بھیجے کی مقدار اس جسمی حالت سے وہ نسبت رکھتی ہے جو چالیس کے عدد کو ایک سے ہوتی ہے مگر عورت کا بھیجا اس کی جسمانی قوت سے چوالیس اور ایک کی نسبت رکھتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر عورت کے بھیجے کی کمی جسمانی ضعف پر مبنی ہے تو مقابلۃً یہ اختلاف کیوں پایا جاتا ہے؟

۳۔ علاوہ اس کے عورت کے سر کے بھیجے میں خم وپیچ نہایت کم ہیں اور اس کے پردوں کا نظام بھی نامکمل ہے۔ علمائے نفسیات نے اس اختلاف کو ان دونوں جنسوں کے ممیزات میں ایک اہم قرار ممیز دیا ہے۔

۴۔ اسی طرح مرد اور عورت کے بھیجوں کا جوہر سنجابی میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ جوہر سنجابی قوت ادراک کا نقطہ اور مرکز ہے اس لیے یہ اختلاف کوئی معمولی اختلاف نہیں ہے۔

۞ ۞ ۞

ایک اعتراض اور اس کا جواب

ممکن ہے کہ ایک شخص ان تمام تشریحی دلائل کو دیکھ کر یہ اعتراض کرے کہ جو دماغی اختلاف تم نے ثابت کیا ہے وہ نتیجہ ہے مرضوں کے تسلط، جبر، ظلم اور بے رحمی کا۔ ایک زمانہ دراز سے عورتیں غلامی میں زندگی بسر کر رہی ہیں اور تہذیب و شائستگی، تعلیم و تمدن سے (جو عقلی نشوونما کے باعث ہوتے ہیں) قطعی محروم ہیں۔ اگر ان کے طول طویل زمانے تک اس امر کا موقع دیا جائے کہ مردوں کی طرح تعلیم و شائستگی حاصل کریں اور قوائے عقلی کے زنگ کو دور کریں تو کیا عجب ہے کہ ان کے دماغی قویٰ ترقی کر کے مرد کے قویٰ کے مساوی ہو جائیں اور وہ ضعف جو ان دونوں جنسوں میں مابہ الامتیاز قرار دیا جاتا ہے، مفقود ہو جائے چنانچہ قاسم امین بک نے بھی اس اعتراض کو پیش کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

"اس میں شک نہیں کہ آج کل عورت مرد سے ہر حیثیت میں کم نظر آتی ہے لیکن ہم کو غور کرنا چاہیے کہ یہ اس کا طبعی اور خلقی ضعف ہے یا تربیت کی خرابی؟ بلکہ طویل مدت کی غلامی نے اس کو اس ادنیٰ حالت تک پہنچا دیا ہے۔"

پھر یورپ کے دو مصنفوں کے اقوال سے استشہاد کیا ہے چنانچہ لاربٹ پروفیسر فزیالوجی لکھتا ہے:

"محض ان آثار اور نتائج کی بناء پر جو اس وقت تک عورت کے متعلق دریافت ہوئے ہیں؟ اس کی طبیعت کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی ہے۔ اگر عورت بھی اپنی فطرت آزادی سے اسی طرح مستفید ہو جس طرح مرد اپنی آزادی کے مالک ہیں اور عورت کو بھی اپنے عقل و شعور کی ترقی کے لیے اتنی مدت دی جائے جتنی مدت مرد نے اپنی عقل کی نشوونما کے لیے صرف

کی ہے تو اس وقت بیشک کسی قسم کا صحیح فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔"

پروفیسر مے تن جاوز لکھتا ہے کہ:

"سب سے بڑا فرق جو مرد اور عورت کے دماغی قویٰ میں پایا جاتا ہے اس کی وجہ وہ حالت غلامی ہے جس میں ایک زمانہ دراز سے عورت گرفتار ہے۔"

حساس طبیعتیں ممکن ہے کہ ان اقوال کے رعب میں آ جائیں لیکن ہم پر ان کا جادو کارگر نہیں ہو سکتا۔ فزیالوجی اور سائیکولوجی کے محققانہ اصول پیش نظر ہیں اور وہ ثابت کر رہے ہیں کہ یہ اعتراض بھی مدافعت کے لیے کافی نہیں۔

اول تو وہ قومیں جو زمانہ دراز سے حالت وحشت میں زندگی بسر کر رہی ہیں اور جن کا ایک بڑا حصہ دنیا کے مختلف حصوں میں اب بھی موجود ہے اس اعتراض کی غلطی پر شاہد ہیں۔ ان میں اگر تعلیم وتمدن نہیں تو کسی ایک جنس ہی میں نہیں ہے بلکہ مرد اور عورت دونوں میں نہیں ہے۔ ان میں اگر وحشت پائی جاتی ہے تو صرف عورتوں ہی میں نہیں پائی جاتی بلکہ مرد اور عورت دونوں میں پائی جاتی ہے پھر اگر یہ اعتراض صحیح ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ یہ جسمانی اور دماغی فرق متمدن ممالک کی طرح ان میں بھی پایا جاتا ہے۔ کیا افریقہ کی وحشی قوموں نے بھی عورتوں کو تعلیم اور شائستگی سے محروم رکھا ہے؟ کیا وحشت کے ساتھ ان میں یہ امتیاز نہیں پایا جاتا ہے؟

دوم یہ کہ اگر یہ اختلاف مردوں کے تمدنی مشاغل میں عدم مشارکت کا نتیجہ ہے اور اس پر مبنی ہے کہ عورتوں کو مردوں کے تسلط سے آزادی نہیں نصیب ہوتی تو سوال یہ ہے کہ وحشی اقوام میں یہ فرق کس بناء پر پایا جاتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ممالک حارہ کی رہنے والی وحشی اقوام میں مردوں کی طرح عورتیں بھی بالکل آزاد اور مستقل ہیں۔ یہاں تک کہ تمام خارجی کام بھی مثل زراعت اور آبپاشی وغیرہ بھی عورتیں ہی کیا کرتی ہیں پھر متمدن ممالک کی طرح یہ دماغی اور جسمانی اختلاف ان اقوام میں کیوں پایا جاتا ہے؟ انسائیکلوپیڈیا بھی اس رائے میں ہم سے متفق ہے۔ اس کا فاضل ایڈیٹر پروفیسر وفارینی لکھتا ہے:

''جس طرح مرد اور عورت کے جسمانی اور دماغی قویٰ کا باہمی اختلاف تم کو پیرس جیسے متمدن شہر کے شائستہ باشندوں میں نظر آتا ہے۔ بعینہ اسی طرح امریکہ کی وحشی اقوام میں بھی پایا جاتا ہے۔''

ایک عجیب بات ہے کہ ادھر تو یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ عورتوں کی گزشتہ وحشت نے ان کے جسمانی اور دماغی قویٰ کو ضعیف کر دیا ہے اور ادھر یورپ کے فاضل مصنفین اور علماء کا یہ خیال ہے کہ تمدن کی ترقی عورت اور مرد کے طبعی اختلاف کو زیادہ کر رہی ہے۔ پروفیسر دوفارینی انسائیکلوپیڈیا میں لکھتا ہے کہ:

''تمدن کے بڑھنے کے ساتھ ہی قدرتی اختلاف کی وضاحت بھی زیادہ ہو جاتی ہے چنانچہ گوری رنگت کے مردوں اور عورتوں میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ سیاہ فام رنگ کے وحشی مردوں اور عورتوں کے باہمی اختلاف سے کئی درجہ بڑھا ہوا ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ مرد اور عورت کا جسمانی اور دماغی اختلاف ایک طبعی اختلاف ہے جس کی کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی۔ فرض کر لو کہ تشریح اور فزیالوجی کی یہ تمام دقیق بحث سر سے پیر تک غلط ہی ہے، یہ بھی تسلیم کر لو کہ اگر اختلاف پایا بھی جاتا ہے تو صرف اسی حد تک جس حد تک خارجی اثرات نے عورتوں کو ضعیف کر دیا ہے لیکن اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے کہ حیوانات اور نباتات کی طبعی حالت بھی اس اختلاف کی صاف شہادت دے رہی ہے صرف اتنا ہی نہیں بلکہ جہاں تک کیمسٹری کی علمی تحقیقات اور تجارب نے پتہ لگایا ہے جمادات بھی اس اختلاف سے محفوظ نہیں۔ عود خرما اور کیلا کے درختوں میں جہاں نر اور مادہ کا امتیاز ثابت ہوا ہے وہاں یہ بھی ثابت ہوا کہ نر درخت کو مادہ درخت پر طبعی قوت کے لحاظ سے فوقیت حاصل ہے۔ حیوانات میں نر کو جو تسلط اور غلبہ اپنی مادہ پر ہوتا ہے اس کے لیے علمی دلائل کی ضرورت نہیں، روزانہ مشاہدہ کافی ہے۔ نر اپنی مادہ کی خبر گیری اور حفاظت کرتا ہے حمل کے زمانہ میں اس کو آرام سے رکھتا ہے۔ خود پر اس کو ترجیح دیتا ہے۔ نسبتاً زیادہ محنت کرتا ہے۔ اس سے زیادہ یہ کہ مادہ سے نر کا قد و قامت عموماً زیادہ ہوتا ہے۔ تشریح نے ثابت کر دیا ہے کہ نر کے جسمانی قویٰ خارجی اور داخلی اعضاء مادہ سے بہت زیادہ قوی

ہوتے ہیں۔ طب کا محققانہ اصول ہے کہ مادہ کی نسبت نر کا گوشت زیادہ مقوی اور زیادہ طاقت بخش ہوتا ہے۔ کیا یہ تمام باتیں اس امر کا بین ثبوت نہیں ہیں کہ مخلوقات میں اناث اور رجال کا جنسی اختلاف خارجی اثرات کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ خود فطرت نے جسم و دماغ تقسیم کرتے ہوئے عورتوں کو مردوں سے کم حصہ بخشا۔ گزشتہ صفحات میں جو دلائل پیش کیے گئے ہیں اگر ثبوت دعویٰ کے لیے وہ کافی نہ سمجھے جائیں تو ابھی بیسوں اختلاف دکھلائے جاسکتے ہیں۔

فزیالوجی کا یہ مسلم اصول ہے کہ انسان کی عقلی قوت وضعف کا سرچشمہ دماغ ہے۔ احمقوں اور بیوقوفوں کا دماغ مشاہری عقلاً کے دماغ سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ جو لوگ زندگی میں احمق اور لا یعقل مشہور تھے جب ان کے دماغ کا وزن کیا گیا تو تمیں اوقیہ سے کسی حالت میں زیادہ ثابت نہیں ہوا لیکن جن لوگوں کو عقل کی تیزی، ذہن کی سرعت، خیال کی بلندی عام طور پر مسلم تھی ان کے دماغ تولے گئے تو ساٹھ اوقیہ سے بھی وزن میں متجاوز ثابت ہوئے۔ یہی قوائے عقلیہ کا سرچشمہ ہے جس میں مرد کا پایہ عورت سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے۔ مرد کے دماغ کے وزن کا اوسط عام طور پر ۲/۱/۴۹ اوقیہ ہے اور عورت کے دماغ کا وزن ۴۴ دوسو اٹھہتر۔ مردوں کے دماغ وزن کیے گئے تو سب سے بڑے دماغ کا وزن ۱۶۵ اوقیہ اور سب سے چھوٹے دماغ کا وزن ۱۳۴ اوقیہ ثابت ہوا لیکن جب دوسو اکانوے دماغ عورتوں کے وزن کیے گئے تو سب سے زیادہ وزنی دماغ ۱۵۴ اوقیہ کا اور سب سے کم وزنی دماغ ۱۳۱ اوقیہ کا نکلا۔ کیا یہ اختلاف اس امر کا بہترین ثبوت نہیں ہے کہ عورتوں کے عقلی قویٰ مردوں کے قویٰ سے بدرجہا ضعیف ہیں۔ دماغ جو قوائے عقلی کا اصلی مرکز ہے جب اس کا یہ حال ہے تو پھر عورتوں کا دل گردہ کہاں جو مردوں کی برابری کا دعویٰ کرسکیں۔ ؎

جو لوگ یورپ کی معمولی سے معمولی آواز کو بھی وحی الٰہی سمجھتے ہیں ان کے لیے قاسم امین بک کا یورپ کے دو تین اقوال کو پیش کر دینا یہ حکم رکھتا ہے کہ اس کے آگے اطاعت کا سر فوراً جھکا دیں۔ اس لیے ان تمام آراء کو پیش کرنے کے بعد ہم ان کی بھی قلعی کھول دیتے ہیں۔

ہم نے جو اقوال پیش کیے ہیں وہ ان کے لوگوں کے ہیں جو آج یورپ میں مشاہیر فلاسفہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ہم نے جابجا انسائیکلوپیڈیا کے اقوال سے استشہاد کیا ہے اور انسائیکلو پیڈیا علوم عصریہ کا عطر اور انیسویں صدی کے اعاظم اور کبار علماء کی آراء کا خلاصہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں مے تن جاوز غیرہ کے اقوال وہ نسبت رکھتے ہیں جو قول احاد کو جمہور کی رائے سے ہوتی ہے۔

اپنے تمام تشریحی ضعف کے ساتھ عورت میں اپنے انفعال اور ہیجان کی قوت مرد سے بہت زیادہ ہے۔ اس کے دماغ میں احساس اور تہیج کے مرکز مرد کے دماغ کی نسبت بہتر ترکیب رکھتے ہیں او ریہی ایک چیز ہے جس میں عورت کا پلہ مرد سے بڑھا ہوا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس قوت سے بھی عورت کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی کیونکہ ہیجان اور احساس کی زیادتی کا نتیجہ یہ ہے کہ عورت عقلی دائرہ میں اور زیادہ ناکام ہو گئی ہے چنانچہ انسائیکلو پیڈیا میں پروفیسر دوفارینی لکھتا ہے:

''یہ اختلاف ان دونوں جنسوں کے ظاہری ممیزات کے بالکل مطابق ہے۔ مرد میں ذکاء و فہم اور ادراک کا مادہ تیز ہے اور عورت میں انفعال اور ہیجان کا جذبہ بڑھا ہوا ہے۔''

ایک اور مشہور مصنف علامہ ترو سیہ ہیجان کی زیادتی سے عورت کے ضعف پر استدلال کرتا ہے۔ اس کے اصل الفاظ یہ ہیں:

''عورت کے عصبی ضعف کا یہ نتیجہ ہے کہ تم اس کے مزاج میں مرد کی نسبت زیادہ ہیجان پاتے ہو اور اس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو اپنے طبعی فرائض، حمل، وضع اور رضاع سے پیدا ہونے والی مختلف قسم کی تکلیفوں اور خطروں میں ڈال دیتی ہے۔''

راز درون پردہ زندان مست پرس
کیں حال نیست صوفی، عالی مقام را

یورپ کی جدید تشریحی تحقیقات اور علم فزیالوجی نے ثابت کر دیا ہے کہ مرد اور عورت ہر حیثیت سے برابر ہیں۔

ر آزادی نسواں کی حامی پارٹی نے اس وقت جس قدر دلائل جمع کیے ہیں اگر ان کی تحلیل کی جائے تو آخر میں صرف یہی مانند عروۃ الوثقی دلیل رہ جائے گی۔ جو اوپر کی دو سطروں میں محدود کر دی گئی ہے۔

اگر تمہارے دوستوں میں کوئی شخص پردہ کا مخالف اور آزادی کا حامی ہے۔ اگر کبھی اس خیال کے نوجوان سے تم کو گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا ہے تو اچھی طرح یاد کرو، بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا ہوگا کہ یورپ کی نئی تحقیق نے مرد اور عورت کے جسمی اور عقلی قوت کو ایک سطح پر پہلو بہ پہلو کھڑا کر دیا ہے، اس نے نہایت جوش میں بے باکانہ کہا ہوگا کہ مشرق کا یہ قدیم ظالمانہ خیال ہے کہ عورت مرد کی برابری نہیں کر سکتی مگر آج یورپ نے اس غفلت کے پردے کو چاک کر دیا ہے اور عورت کی اصلی صورت دنیا کو دکھلا دی۔ اس نے بہت دیر تک موثر اور ہنگامہ خیز تقریر کی ہوگی لیکن اس دعویٰ کے مرکز سے ایک انچ بھر نہ ہٹا ہوگا۔ اس کی تمام تقریر اور تمام دلیلیں ایک تشریح طلب عبادت ہوگی جس کی تفسیر میں وہ کئی گھنٹے سرگرم سخن رہا ہوگا، قاسم امین بک نے جب اس عنوان پر قلم اٹھایا، تو وہ بھی اس مرکز سے ہٹنے کی جرات نہ کر سکا "المراۃ الجدیدہ" اور "تحریر المرأۃ" کی سیر کرو جہاں کہیں مساویانہ حقوق کی فریاد ہے اسی دلیل کے بل پر ہے۔ یہی وہ دعویٰ ہے جس کے آگے پردہ کی حامی جماعت دم بخود ہو کر خاموش ہو جاتی ہے۔ مذہب کا زور دکھلایا جاتا ہے تو وہ بھی ناکام ہو کر الگ ہو جاتا ہے۔ یورپ کا قول اور حال زبان کی بے خبری نے چھپا دیا۔ لہٰذا ان میں اتنی صلاحیت نہیں کہ جستجو کی کوشش کریں اور دعویٰ کی صداقت کا سراغ لگائیں۔

لیکن ہم پر اس دعویٰ کا جادو اسی طرح ناکام رہا جس طرح مذہب کا معجزہ مخاطب جماعت کے لیے بے سود تھا۔ یورپ کے مشاہیر علماء کی آراء پیش نظر تھیں اس لیے جو کچھ مطالب کا دیکھا پیش کر دیا۔

گزشتہ فصل میں ہم نے اس کا بڑا حصہ نقل کر دیا ہے۔ کیا ممکن ہے کہ اس کے پیش کر دینے کے بعد اس دعویٰ کا طلسم ٹوٹ کر ھَبَآءً مَّنْثُوراً نہ ہو جائے۔ کہا جاتا ہے کہ یورپ نے مشرق کے قدیم پردہ غفلت کو چاک کر دیا لیکن گزشتہ فصل اپنے سامنے رکھ لو اور منصفانہ کہو کہ ہم نے مخالف

پارٹی کے تیس برس کے پردہ فریب کو چاک نہیں کر دیا؟ علم تشریح، فزیالوجی اور سائیکالوجی کے جلیل القدر علمائے یورپ کے جو اقوال پیش کیے ہیں، کیا ان کے مقابلے میں کسی کی جرات ہے کہ پھر اس دعوے کا اعادہ کر سکے؟ کیا ان کے اقوال پیش کر دینے کے بعد بھی اس دعوے میں کچھ جان باقی ہے؟ اگر ہے تو آؤ آج اس کا بھی فیصلہ کر ڈالیں۔

ہمارے دوستوں کو آزادی کا شور مچاتے ہوئے کامل ایک قرن ہو گیا ہے لیکن اس عرصہ میں کسی تعلیم یافتہ شخص نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ یورپ کی منتخب جماعت کی آواز کہاں تک ان کی تائید کرتی ہے۔ ہندوستان کے تعلیم یافتہ گروہ کی عام علمی معلومات سے قاسم امین بک کا دائرہ علم بہت زیادہ وسیع ہے لیکن گزشتہ فصل پر ایک نظر ڈال لینے کے بعد کیا تم پر حیرت طاری نہیں ہو جاتی کہ جمہور کی اس بلند آواز سے کیونکر اس باخبر شخص کی قوت سامعہ بے خبر رہی۔ یہ حیرت اور زیادہ بڑھ جائے گی جب تم دیکھو گے کہ تشریحی اور فزیالوجی کی تحقیقات کے علاوہ عورت کے قدرتی فرائض کے متعلق اعاظم اور کبائر علمائے یورپ کی کیا رائے ہے؟ کس طرح وہ عورتوں کو فطرتاً فرائض منزلی کے لیے مخصوص قرار دیتے ہیں؟ اور کس طرح وہ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ عورت کا اپنے قدرتی فرائض سے باہر قدم نکالنا دنیا کی تباہی ہے، تمدن کی بربادی ہے اور معاشرت کے لیے خوفناک شگون ہے۔

قاسم امین بک نے اس دعوے کو جن اقوال ثلاثہ کے ساتھ پیش کیا ہے وہ گزشتہ فصل میں تمہاری نظروں سے گزر چکے ہیں لیکن ایک اور موقع پر اس سے بھی زیادہ دھوکہ دینے والی عبارت میں یہ خیال ظاہر کیا ہے اور دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ یورپ کی تمام علمی جماعتیں یا تو عورتوں کی موجودہ حریت پر قانع ہیں یا موجودہ آزادی سے بھی زیادہ آزادی کی خواستگار ہیں اور وہاں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو الفاظ کا مخالف ہو۔ اس کے اصل الفاظ یہ ہیں:

''اسی بناء پر یورپ اور امریکہ میں جو لوگ انسانی ترقی کے طالب ہیں، اس امر کی کوشش کر رہے ہیں کہ عورت جس آزادی اور استقلال کے درجہ تک پہنچ چکی ہے اس سے بھی زیادہ تر

درجہ کمال کی طرف ترقی کرے۔ان کی اصلی غرض دنیا کی اس قدیم جہالت پر جہاد کرنے کی یہ ہے کہ انسان کی یہ دونوں جنسیں ایک نظر سے دیکھی جائیں اوران میں باہم کوئی فرق نہ رہے چنانچہ آج کل یورپ اور امریکہ میں دو جماعتیں ہیں جو اس مسئلہ کے متعلق مختلف رائیں رکھتی ہیں۔

پہلی جماعت اس آزادی اور حریت کو عورتوں کے لیے کافی سمجھتی ہے جو مغربی عورتوں نے اس زمانہ میں حاصل کر لی ہے۔دوسری جماعت موجودہ حالت پر اکتفانہیں کرتی اوراس سے بہتر حالت کی طلبگار ہے وہ اس کوشش میں ہے کہ عورتیں یہاں تک ترقی کریں کہ ان میں اور مردوں میں کوئی فرق باقی نہ رہے۔[1]

لیکن صرف اس قدر کہہ دینا ہی کافی نہیں ہے۔ان لوگوں کے نام پیش کرنا چاہیں جو موجودہ آزادی پر قانع یا کلی مساوات کے طلبگار نہیں کیونکہ جو جماعت علم وفضل کے لحاظ سے آج یورپ میں اعلیٰ درجہ کی جماعت تسلیم کی جاتی ہے ان کی تصنیفات موجود ہیں۔مساوات کا خواستگار ہونا ایک طرف وہ تو موجودہ آزادی کو ایک خوفناک تمدنی مرض سے تعبیر کرتے ہیں۔

اگر ایک شخص کسی خاص ملک کے متعلق یہ دعویٰ کرے کہ وہاں کے لوگ فلاں خیال یا عقیدے کو تسلیم نہیں کرتے اور مخاطب کو اس کے تسلیم کرنے میں تامل ہو تو اس کا فیصلہ بغیر اس کے نہیں ہوسکتا کہ اس ملک کے اعاظم جلیل القدر علماء کی آراء اس دعویٰ کی تصدیق کرتی ہوں یا وہ خیال ان میں بالکل نہیں پایا جاتا۔ہم نے اسی اصول کو پیش نظر رکھا اور مشہور علمائے یورپ کی ورق گردانی کی۔ہم پر یہ ثابت ہوا کہ ان کے متعلق یہ دعویٰ صحیح نہیں ،ہم نے انسائیکلو پیڈیا کے اقوال پیش کیے جو علوم عصر اور علمائے یورپ کی آراء کا خلاصہ ہے۔ہم نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آگسٹ کونٹ۔پرودن، ژول سیماں جیسے روسا اور مستند علماء کی شہادتیں نقل کیں جو آج یورپ میں آسمان علم کے آفتاب سمجھے جاتے ہیں۔

قاسم امین بک لکھتا ہے کہ یورپ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو عورتوں کی موجودہ آزادی پر قناعت نہیں کرتے اور کلی آزادی کے طالب ہیں مگر ہم کہتے ہیں کہ صرف اس مسئلہ پر موقوف نہیں یورپ تو دنیا بھر کے متضاد اور عجیب وغریب خیالات کا مخزن ہے۔ یورپ میں وہ لوگ بھی موجود ہیں جو مذہب کے قدیم سلسلے کے مخالف ہیں، وہ بھی ہیں جو اباحت عامہ کے قائل ہیں اور ہر قسم کے انسانی خواہشوں اور ارادوں کو جائز قرار دیتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو تمدن و معاشرت کی تمام خواہشوں کو فضول سمجھتے ہیں اور نظام حکومت کے دشمن ہیں۔ وہ بھی ہیں جو روحانیت کے خیال کو ایک خبط اور وحشت بتلاتے ہیں تو کیا اہل مشرق پر واجب ہے کہ ہر قسم کی آواز جو سرزمین مغرب سے بلند ہو یا یورپ کی طرف منسوب ہو۔ اس کے آگے اطاعت اور تسلیم کا سر جھکا دیں۔

یورپ میں ہر خیال کے لوگ موجود ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کون سی جماعت علم وفضل کے لحاظ سے سربرآوردہ اور قابل اعتماد واستناد سمجھی جاتی ہے۔ کس گروہ کا قول علم اور عقل کے معیار پر ٹھیک اترتا ہے؟ ہم نے ان لوگوں کے اقوال منتخب کیے ہیں جن کو ملک نے موجودہ مدنیت کے مجدد، فلسفہ، حسی کا افضل ترین عالم اور علوم عصریہ کا اعلیٰ ترین معلم تسلیم کرلیا ہے۔ جن کا قول علم و عقل کے موافق ہے۔ ان کے مقابلہ میں اگرچہ مستند لوگوں کے اقوال پیش بھی کیے ہیں تو ان کا کوئی اثر ہماری طبیعت قبول نہیں کرسکتی۔

❋ ❋ ❋

عورت کی آزادی اور فرائض کے متعلق

علمائے یورپ کا فیصلہ

قدرت نے نظام تمدن کے دو حصے کر دیے ہیں۔ ''فرائض منزلی'' اور ''فرائض تمدنی'' پہلا کام عورت کے ذمے قرار دیا اور اس کو رَبَّۃُ الْعَآئِلَۃِ بنایا۔ دوسرا کام مرد کے متعلق کیا اور اس کو تمدنی مملکت کا تاجدار بنایا۔ اس لیے درحقیقت قدرت نے مرد اور عورت کو دو علیحدہ جنسوں میں منقسم نہیں کیا بلکہ انسانی ضرورتوں پر نظر رکھتے ہوئے دونوں کی مجموعی طاقت کو شخص کامل کی صورت میں مخلوق کیا ہے۔ مرد میں بذات متعدد نقص ہیں جو کامل نہیں ہو سکتے جب تک اگر عورت شریک حال نہ ہو، اسی طرح عورت میں بہت نقص ہیں جو کامل نہیں ہو سکتے۔ اگر مرد اس کی اعانت سے دستبردار ہو جائے۔ اس بناء پر مرد اور عورت نظام تمدن قائم ہے۔ جو لوگ اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ عورت کو درجہ استقلال حاصل ہو جائے ان کی مثال بالکل اس شخص کی سی ہے جو آکسیجن اور ہائیڈروجن کی مجموعی طاقت کو ضائع کرتا جائے اور اس خبط میں مبتلا ہو کہ ان میں سے کوئی ایک عنصر مستقل ہو جائے حالانکہ اس کو معلوم ہے کہ پانی عبارت ہے ان دونوں کی ترکیبی اور مجموعی قوت ہے۔ اگر یہ ممکن ہے کہ ان دو میں سے ایک عنصر دوسرے عنصر سے مستغنی ہو کر درجہ استقلال حاصل کر لے اور پانی کی طبعی تکوین میں بھی فرق نہ آئے تو یہ بھی ممکن ہے کہ عورت مرد کے مشاغل میں شریک ہو جائے لیکن تمدن متزلزل نہ ہو لیکن ہم کو معلوم ہے کہ ایسا ہونا محال قطعی ہے جس طرح ہائیڈروجن کے مقابلہ میں آکسیجن ثقل میں زیادہ ہے اسی طرح عورت کے مقابلہ میں مرد کی جسمی اور دماغی قوت زیادہ ہے جس طرح ہائیڈروجن کے ثقل کی زیادتی پانی کی طبعی تکوین کی مخالف ہے۔ بعینہٖ اسی طرح عورت کا استقلال نظام تمدن اور معاشرت کی تکمیل کے لیے سم قاتل ہے۔ عادم مادیہ کا افضل ترین عالم یورپ

کا سر برآوردہ مصنف ژول سیماں اپنے ایک مضمون میں جو ''ریویو آف ریویوز'' میں شائع ہوا تھا اور جس میں ایک فرانسیسی عالم لوز و یہ کی تصنیف پر ریویو کیا گیا ہے، لکھتا ہے:

''عورت کو چاہیے کہ عورت رہے۔ ہاں! بیشک عورت کو چاہیے کہ عورت رہے۔ اسی میں اس کی فلاح ہے اور یہی وہ صفت ہے جو اس کو سعادت کی منزل تک پہنچا سکتی ہے۔ قدرت کا یہ قانون ہے اور قدرت کی یہ ہدایت ہے۔ اس لیے جس قدر عورت اس سے قریب تر ہوگی اس کی قدر و منزلت بڑھے گی اور جس قدر دور ہوگی اس کے مصائب ترقی کریں گے۔ بعض فلاسفر انسان کی زندگی کو پاکیزگی سے خالی سمجھتے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ انسان کی زندگی دلفریب، پاک اور بے حد پاکیزہ ہے۔ بشرطیکہ ہر مرد اور ہر عورت اپنے اُن مدارج سے واقف ہو جائے جو قدرت نے اس کے لیے قرار دیے ہیں اور اپنے ان فرائض کو ادا کرے، جو قدرت نے اس کے متعلق کر دیے ہیں۔''

تم کو حیرت ہوگی کہ یہ عظیم الشان فلاسفر عورت کو عورت رہنے کی تعلیم کیوں دیتا ہے؟ حالانکہ کوئی عورت اپنے جنسی دائرے سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی۔ عورت، عورت ہے اور مرد، مرد مگر حیرت رفع ہو جائے گی جب تم کو یہ معلوم ہوگا کہ عقلائے یورپ، یورپ کی عورتوں کو عورت تسلیم نہیں کرتے کیونکہ درحقیقت انہوں نے اپنے جنسی فرائض بھلا دیے ہیں اور اپنے طبعی دائرے سے باہر قدم نکالنا چاہتی ہیں۔ یہی عالم ایک اور موقع پر لکھتا ہے:

''جو عورت اپنے گھر سے باہر کی دنیا کے مشاغل میں شریک ہوتی ہے اس میں شک نہیں کہ وہ ایک عامل بسیط کا فرض انجام دیتی ہے مگر افسوس ہے کہ عورت نہیں رہتی۔''

مشہور مصنف پروفیسر ''جیوم فریرو'' نے ''جو اطوار انسانی کا مستند نقاد ہے'' ۱۸۹۵ء میں ایک مضمون لکھا تھا جو ریویوز میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں اس نے نہایت درد انگیز الفاظ میں ان عورتوں کی افسوسناک حالت کی تصویر کھینچی ہے جو یورپ میں موجودہ آزادی سے متاثر ہو کر مردوں کے مشاغل میں شریک ہو گئی ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

''ان عورتوں کو معاشرت کے اصلی اصول ''زوجیت'' سے سخت نفرت ہے۔ قدرت نے جس

غرض سے ان کو خلق کیا ہے اور جس کام کے لیے ان کو جسمانی اور دماغی اعضاء عطا کیے ہیں، اس کو انہوں نے بالکل فراموش کر دیا ہے۔ ان میں وہ طبعی حاسہ اور جنسی امتیاز بالکل نہیں پایا جاتا جو ان کی ہم عمر عورتوں میں فطرتاً موجود ہے۔ ان کی حالت ایک ایسے درجے تک پہنچ گئی ہے جس کو مالیخولیا سے تعبیر کرنا چاہیے۔ درحقیقت نہ ان کو مرد کہا جا سکتا ہے اور نہ وہ عورت ہیں بلکہ ایک تیسری جنس کا نمونہ بن گئی ہیں۔ اگر وہ مرد اس لیے نہیں ہیں کہ مردوں سے طبعاً اور ترکیباً مختلف الجنس ہیں اور عورت بھی اس لیے نہیں ہیں کہ ان کا عمل اور وظیفہ فرائض نسوانی سے بالکل مختلف ہے۔ علمائے یورپ اس عظیم الشان نقص مدنیت پر غور کر رہے ہیں جو قوانین قدرت کے منافی اور اس کی حدود کو توڑنے والا ہے۔ اگر عورتوں کی یہ افسوسناک حالت اسی طرح کچھ عرصہ تک قائم رہی تو سمجھ لینا چاہیے کہ عنقریب سوسائٹی میں ایک عظیم الشان خلل پیدا ہو جائے گا جو تمدن اور معاشرتی بنیادوں کو متزلزل کر دے گا۔''

حیرت ہے کہ حریت کے طلبگار عورت کی غلامی کی فریادوں سے کنگورہ عرش کو ہلانا چاہتے ہیں مگر اس پر غور نہیں کرتے کہ قدرت نے مرد کو عورت کا کس طرح محکوم اور غلام بنا دیا ہے؟ قدرت نے مرد کا فرض قرار دیا ہے کہ عورت کے تغذیہ اور آرام و راحت کے لیے اپنے آپ کو تمدن کی مہلک موجوں میں ڈال دے اور جانکاہ مراحل برداشت کر کے سمندر کی تہہ تک پہنچے اور موتیوں کا خزانہ نکال کر عورت کے قدموں پر ڈال دے۔ اس سے زیادہ حیرت یہ ہے کہ عورت کے فرضی وکیل اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ خود عورت کو اپنی طبعی ضروریات کا کفیل ہونا چاہیے اور مردوں کے مشاغل میں شریک ہو کر اپنے آپ کو سیاست اور تمدن کے مناقشات میں مبتلا کرنا چاہیے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عورت پر یہ ظلم اور بے حد ظلم نہیں ہے کہ ایک طرف فرائض منزل اور بقائے نوع انسانی کا اس کو ذمہ دار قرار دیا جائے اور دوسری طرف تحقیق جرائم اور تلاش معاش کا بھی اس پر بار ڈالا جائے۔ کیا یہ غلامی نہیں ہے کہ مرد اپنا کام بھی عورتوں کے سپرد کر کے طبعی فرائض کی انجام دہی سے سبکدوش ہو جائیں اور عورت کو فرائض منزل کے ساتھ تمدن اور سیاست کے انتظام و اہتمام کا بھی ذمہ دار قرار دیں؟ غور سے دیکھو انصاف یہ ہے کہ عورت کو اس کے فرائض طبعی کے میدان میں آزاد اور حر مطلق چھوڑ دیا جائے اور وہ اس کام کو اطمینان اور راحت کے ساتھ انجام دے جس کی صلاحیت اور قدرت فطرت نے اس کو عطا فرمائی ہے۔ ساتھ ہی اس کشمکش سے محفوظ رہے جس کی

صلاحیت اور قابلیت سے فطرت نے اس کو محروم رکھا ہے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ اگر تمدنی ترقی اور کمال انسانی کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ عورت استقلال اور عام آزادی کے درجہ تک صعود کر جائے اور مردوں کے مشاغل میں شریک ہو جائے پھر کیوں نہ وحشی ممالک کو دنیا کا اعلیٰ ترین متمدن حصہ نہ قرار دیا جائے جبکہ وہاں مرد خالی الذہن اور غیر مکلف ہوتا ہے اور تمام کام صرف عورتیں کرتی ہیں۔

درحقیقت خود قدرت اس الزام کی ذمہ دار ہے کہ کیوں عورتوں کو نظام تمدن میں کافی حصہ نہیں دیا، عورت کی فطرت کے داخلی اور خارجی اعضاء سر سے پیر تک کی مجموعی ہیئت صاف صاف بتلا رہی ہے کہ وہ اس کام کے لیے ہرگز خلق نہیں کی گئی جس کو عورت کے فرضی وکیل اس کے لیے تجویز کر رہے ہیں۔ یورپ کے وہ عالم جو فلسفہ حسی کے مجدد، اعلیٰ ترین مصنف اور فلسفہ جدید کے مسلمہ ارکان ہیں پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ عورتوں کو گھر سے باہر کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں، اس کا کام نوع انسانی کی حفاظت اور صرف فرائض منزلی کو انجام دینا ہے مگر افسوس:

گوش سخن شنو کجا دیدۂ اعتبار کو

مشہور سوشلسٹ فلاسفر علامہ پروڈن اپنی قابل قدر کتاب ''ابتکار النظام'' میں لکھتا ہے کہ:

''عورت کو تمدن انسانی میں قدرت نے بالکل حصہ نہیں دیا۔ وہ علم کا راستہ طے کرنا چاہتی ہے مگر علم اس سے مساعدت نہیں کرتا، اسی کا نتیجہ ہے کہ خوفناک نتائج کے ظہور پذیر ہونے کے ہم متوقع ہیں۔ نوع انسانی عورت کی کسی علمی اختراع یا صناعی و ایجاد یا اخلاقی اور سیاسی کوششوں کی ہرگز ممنون نہیں ہے۔ وہ علم کی شاہراہ پر بغیر عورت کی مساعدت کی چلی ہے اور اس نے خود ہی حیرت انگیز عجائبات ظاہر کیے ہیں بلکہ مرد ہی ایک اکیلی ذات ہے جو خود بخود اختراع کرتی ہے، تکمیل تک پہنچاتی ہے، اس پر عمل کرتی ہے، اس سے نتائج پیدا کرتی ہے اور عورت کے تغذیہ اور آرام و راحت کا انتظام کرتی ہے۔''

فلسفہ حسی کا موسس اصول ''نظام تمدن'' کا بانی استاذ الاساتذہ ''آگسٹ کونٹ'' اپنی مشہور تصنیف ''النظام السیاسته علی حسب الفلسفته الحیه'' میں لکھتا ہے کہ:

''جس طرح ہمارے زمانے میں عورتوں کی سوشل حالت کے متعلق خیالی گمراہیاں پیدا ہو رہی

ہیں اسی طرح تغیر نظام، تمدن اور آداب معاشرت کے ہر ایک دور میں پیدا ہوتی رہیں مگر وہ لاز
آف نیچر جو جنس محب (عورت) کو منزلی زندگی کے لیے مخصوص رکھتا ہے اس میں کبھی کوئی تغیر
واقع نہیں ہوا۔ یہ قانون الٰہی اس درجہ صحیح اور محقق ہے کہ گو اس کی مخالفت میں سینکڑوں باطل
خیالات قائم ہوتے رہے ہیں مگر یہ بغیر کسی تغیر یا نقصان کے سب پر غالب آتا رہا ہے۔"

انسان پر موقوف نہیں دنیا میں جتنی چیزیں خلق کی گئی ہیں سب میں جنسی امتیاز پایا جاتا ہے
"قوت فاعلہ" اور "قوت منفعلہ" کی مشترک حالت دنیا کا نظام تمدن قائم رکھتی ہے۔ اس بناء پر
عورت کا استقلال اور تمدنی دنیا میں شرکت یہ مفہوم رکھتی ہے کہ قوت منفعلہ اور قوت فاعلہ کا کام لیا
جائے اور قدرت نے جو نظام مقرر کر دیا ہے اس میں تغیر اور ردوبدل کیا جائے۔

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ (۱:۶۵)

یہی فیلسوف اعظم ایک اور موقع پر لکھتا ہے۔

"مردوں کے مشاغل میں عورتوں کی شرکت سے جو خوفناک نتائج اور فساد پیدا ہو رہے ہیں
ان کا علاج یہی ہے کہ دنیا میں جنس عامل (مرد) پر محب (عورت) کے جو مادی فرائض ہیں
ان کی حد بندی اور تعیین کر دی جائے۔"

"مرد پر واجب ہے کہ وہ عورت کے تغذیہ کا انتظام کرے۔ یہی وہ "قانون طبعی اور ناموس
الٰہی" ہے جو جنس محب کی اصل زندگی کو منزلی دائرے میں محدود کرتا ہے۔ یہی وہ قاعدہ ہے جو
ہیئت اجتماعی کے خوفناک اور مہیب اشکال کو احسن اور اکمل کر دیتا ہے۔ یہی وہ قانون ہے جو
عورت کو اپنے طبعی جذبات کو ابھار کر ترقی نوع انسانی جیسے شریف فرض کی بجا آوری پر آمادہ
کرتا ہے۔ پس وہ تمام مادی ترقی اور علمی کمال جو عورت کی موجودہ حالت ہم سے طلب کر
رہی ہے، بحال قطعی اور محض ناممکن ہے کیونکہ وہ اس ناموس الٰہی اور قانون طبعی سے منطبق نہیں
ہو سکتا اور چونکہ یہ خواہش ناموس الٰہی کے خلاف ہے اور اس کے حکم کو رد کرنا چاہتی ہے۔ اس
لیے اس طبعی جرم کے اثر سے سوسائٹی کا کوئی علاقہ اور حصہ محفوظ نہیں رہ سکتا۔"

تم جانتے ہو کہ یہ کس شخص کا قول ہے یہ اس شخص کا قول ہے، جو علم میں ان کا استاذ الاساتذہ اور فلسفہ حسی کا بانی مبانی ہے اور فلسفہ حسی علم ہے جس کو نوع انسانی کی دماغی ترقی کا آخری زینہ تصور کیا جاتا ہے کیونکہ اشیاء کی حقیقت پر محسوس باتوں کے لحاظ سے حکم لگانے کا صحیح اور تنہا قانون یہی تسلیم کیا گیا ہے۔

سموئل سمائلس انیسویں صدی کا مشہور عالم اور انگلستان کے جدید تمدنی دور کا مسلم موسس ہے جس کی اخلاقی تصنیفات آج یورپ کے تعلیمی نصاب کا ایک جز سمجھی جاتی ہیں۔ یورپ کے تمام فضلاء اور علماء شہادت دے چکے ہیں کہ تمام مصنفین میں ''سمائلس'' اخلاق کا سرخیل اور بزرگ ترین مصنف ہے۔اس سے بڑھ کر مقبولیت کیا ہوسکتی ہے کہ علمی اور اخلاقی سوسائٹی کی طرح مذہبی سوسائٹی بھی اس کی تصنیفات کو بائبل کا ہم پلہ تسلیم کرتی ہے اور اس الماری کو منحوس سمجھا جاتا ہے جس میں سمائلس کی تصنیفات کو جگہ نہ دی گئی ہو۔ یہی عالی دماغ اخلاقی فلاسفر اپنی گراں بہا تصنیف ''الاخلاق'' میں انگلستان کی آزاد عورتوں کی حالت پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''قدیم اہل روما کے نزدیک شریف اور ''ربۃ العائلہ'' عورت کی سب سے زیادہ قابل تعریف اور اعلیٰ درجہ کی قابل مدح بات یہ سمجھی جاتی تھی کہ وہ گھر میں بیٹھنے والی اور گھر سے باہر کی کشمکش سے محفوظ رہے۔ ہمارے زمانے میں بھی کہا جاتا ہے کہ عورت پر جغرافیہ کی تعلیم اس لیے واجب ہے کہ وہ اپنے گھر میں مناسب رخ اور صحیح سمت پر کھڑکیاں بنوا سکے اور علم کیمسٹری کی تحصیل اس لیے فرض ہے کہ جوش کی حالت میں دیگچی کی حفاظت کر سکے کیونکہ لارڈ بائرن باوجود اس کے میلان اور رغبت کے جو اس کو عورتوں کی طرف تھی، یہ رائے رکھتا ہے کہ عورتوں کے کتب خانہ میں ''بائیبل'' اور ''طباخی'' کی کتاب کے سوا اور کوئی کتاب نہیں ہونی چاہیے مگر یہ رائے عورتوں کے اخلاق اور تہذیب کے لحاظ سے غیر معقول اور ان کی ترقی میں ایک رکاوٹ سمجھی جاتی ہے۔''

قدیم اہل روما اور لارڈ بائرن کی رائے لکھنے کے بعد عورتوں کی آزادی اور تعلیم کے متعلق یورپ کی عام رائے نقل کی جاتی ہے کیونکہ وہ اس رائے کو ایک جنون اور مدنیت کے لیے بے حد مضر

قرار دیتا ہے:

''اس رائے کے مخالف ایک اور رائے ہے جو آج تمام یورپ میں شائع اور عام ہو رہی ہے۔ اہل روما اور لارڈ بائرن کی رائے اگر عورتوں کی تہذیبی آزادی اور اخلاقی ترقی کے لیے مضر سمجھی جاتی ہے تو درحقیقت اس دوسری رائے کو دیوانگی اور خبط سمجھنا چاہیے کیونکہ یہ نظام طبیعت پر منطبق نہیں ہوتی۔ اس رائے کا مقصد یہ ہے کہ عورت کو اس قدر مہذب بنایا جائے اور تعلیم سے آراستہ کیا جائے کہ اس میں اور مرد میں ماسوائے جنسی امتیاز کے اور کوئی فرق باقی نہ رہے اور حقوق سیاسی و علمی لحاظ سے مرد اور عورت بالکل مساوی درجہ میں سمجھے جائیں۔''

قدرت نے مرد کو عورت پر فوقیت دی۔ عورت کے لیے غلامی ہے تو اچھی طرح سمجھ لو کہ عورت کو اس غلامی سے کبھی نجات نہیں مل سکتی۔ قدرت دنیا کی آسائش اور انتظام پر نظر رکھتی ہے۔ ہماری تمہاری آراء پر نظر نہیں رکھتی وہ تمہاری رائے کے تابع ہو کر کیوں عورت کو مستقل اور آزاد کر دے؟ جبکہ اس کا استقلال دنیا کے لیے اور دنیا کے تمدن کے لیے ایک خوفناک بربادی ثابت ہو رہا ہے۔ اس کے لیے فضول شور وغل سے دستبردار ہو کر غور و فکر کی نظر ڈالو۔ دیکھو کہ نظام تمدن میں عورتوں کو کیا مرتبہ دیا گیا ہے؟ دنیا کس درجہ ان کی محتاج ہے؟ اور کس امر میں محتاج ہے؟ خود مردوں کے فرائض کیا ہیں؟ دنیا میں اس وقت عورتوں کو کہاں تک تمدن میں شریک کیا گیا؟ اور اب کہاں تک شریک ہیں؟ پھر جو کچھ علم وعقل کا فیصلہ ہو، اس پر شاکر ہو کر بیٹھ جاؤ کیونکہ قدرت کے قانون میں تغیر ممکن نہیں:

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا (۶۲:۳۳)

مشہور نیشلسٹ فلاسفر فیلسوف اعظم علامہ پرودن ''ابتکار النظام'' میں لکھتا ہے:

''سوسائٹی کی تکوین درحقیقت ان تین عنصروں سے ہوتی ہے۔ علم، عمل اور عدالت۔ اب دیکھو کہ مرد اور عورت کا ان عناصر ثلاثہ میں کس درجہ حصہ ہے؟ اور باہم کس قدر متفاوت ہیں۔ نظام تمدن ہم کو بتلاتا ہے کہ علم، عمل اور عدالت کے لحاظ سے مرد اور عورت میں وہ نسبت

ہے جو ۳×۳×۳ سے ۲×۲×۲ سے ہوتی ہے یعنی ۲۷ اور ۸ کی نسبت ہے۔ اس لیے جو لوگ عورتوں کے لیے آزادی اور استقلال کے طالب ہیں وہ دراصل عورتوں کو شقاوت کے قید خانہ میں مقید کرنا چاہتے ہیں۔ وہ قید خانہ جو مفروضہ عبودیت کے قید خانہ سے کچھ کم نہیں ہے۔''

''چونکہ عورت کو صرف معنوی خوبیاں عطا کی گئیں ہیں۔ اس لیے اس حیثیت سے وہ ایک بیش بہا جوہر ہے اور اس صفت میں مرد پر سبقت لے جانے والی ہے۔ عورت کی ان خوبیوں کا ظہور مرد کی ماتحتی میں رہنے سے ہی ہو سکتا ہے کیونکہ عورت کا فرض صرف اتنا ہے کہ وہ اس بے بہا عطیہ قدرت کو اپنے لیے محفوظ رکھے جو دراصل اس کی مستقل خاصیت نہیں ہے بلکہ ایک ایسی صفت، شکل اور حالت ہے جو اس پر شوہر کی حکومت ماننے کو لازم قرار دیتی ہے۔ پس عورت کا مرد کے ساتھ دعویٰ ہمسری کرنا اس کو نہایت مکروہ اور بدنما بنانے والی بات ہے جس کی وجہ سے وہ تعلقات زوجیت کو توڑنے والی محبت کو مٹانے والی اور نوع انسانی کو ہلاک کرنے والی بن جاتی ہے۔''

لطف یہ ہے کہ قاسم امین بک اور اس کے ہم خیال حضرات تربیت اطفال کو ایک نہایت اہم فرض قرار دیتے ہیں مگر ساتھ ہی آزادی اور استقلال کی فریادیں بھی بلند کرتے ہیں۔ قاسم امین بک لکھتا ہے:

''جمہور کا خیال ہے کہ اطفال کی تربیت ایک معمولی کام ہے جس کو ایک جاہل عورت بھی اچھی طرح انجام دے سکتی ہے مگر جو لوگ فطرت انسانی سے واقف ہیں اور علم کے زیور سے آراستہ ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ نشوونما انسانیہ کوئی اس قدر اہم شے نہیں ہے حالانکہ دنیا کے تمام علمی اور تمدنی کاموں میں سے کوئی کام اس قدر دشوار نہیں ہے جس قدر بچوں کی تربیت اور صحیح تربیت ہے۔ انسان کی تمام علمی اور اخلاقی خوبیوں کا دارومدار محض اس تربیت پر ہے جو عالم طفولیت میں ماں کی توجہ سے انسان حاصل کرتا ہے اور انسان کی علمی ترقی اور اخلاقی کمال

کا حقیقی سرچشمہ وہ قیصر زمانہ ہے جب وہ اپنی ابتدائی عمر میں قدرت کے مقرر کیے ہوئے شفیق معلم صحیفہ فضل وکمال کے دیباچہ کا درس حاصل کرتا ہے۔ علمی حیثیت سے دیکھو تو تربیت اور صحیح تربیت ان تمام علوم کی محتاج ہے جن کی روش میں عورت انسان کی جسمانی اور روحانی نشو ونما کے قوانین سے واقف ہو سکتی ہے۔ محنت اور توجہ کے لحاظ سے تربیت ہی ایک ایسی چیز ہے جس میں بے انتہا صبر اور تحمل کی ضرورت ہے۔ یوم ولادت سے سن بلوغ تک بچے کی نگہداشت کرنا صبر اور تحمل سے اپنی کوشش اور توجہ کے نتائج کا انتظار کرنا اور تقریباً چودہ پندرہ برس کا طول طویل زمانہ ایسی کوشش میں بسر کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔'' (المراۃ الجدیدہ قاسم امین بک)

لیکن سوال یہ ہے کہ جس عورت کے طبعی فرائض میں ایسا اہم اور محتاج علوم ومشقت کام داخل ہے کیا وہ دنیا کے سیاسی اور علمی جھگڑوں میں بھی حصہ لے سکتی ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ تربیت اطفال بے انتہا مشکل اور غیر معمولی توجہ کی محتاج ہے لیکن کیا اس کی اہمیت اور دشواری اس امر کے لیے مستلزم ہے کہ انتظام حکومت اور سیاسی مناقشات کے انفعال کا بار بھی مظلوم اور مسکین عورت پر ڈالا جائے؟ تم کہتے ہو کہ عورت کی آزادی مردوں نے چھین لی ہے اور اسے ظلم وستم کا عادی بنا دیا ہے لیکن سچ سچ بتلاؤ عورت کے تمدن کی کشمکش سے محفوظ رکھنا اور اس امر کا موقع دینا کہ فرائض تربیت کی انجام دہی میں منہمک رہے، انصاف اور حقیقی انصاف ہے یا تربیت جیسی اہم اور مشکل ذمہ داریوں کے ساتھ سیاسی اور تمدنی انتظام کا بھی ذمہ دار بنانا انصاف اور خالص انصاف ہے؟ تم کہتے ہو کہ ہم انصاف نہیں کرتے مگر ہم کہتے ہیں کہ تم عدالت سے کوسوں دور ہو۔ کیا مرد کے فرائض کا بار بھی غریب عورت کے سر ڈالنا غلامی نہیں ہے؟ اور عورت کو اس ناواجب اور خلاف فطرت بوجھ سے بچانا ظالم اور انصاف سے کیسے بعید ہے۔ تم کہتے ہو کہ تربیت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی کام اور دشوار نہیں پھر کیوں اس کو اس امر کا موقع نہیں دیتے کہ وہ اس اہم اور دشوار کام کو تعلیم قدرت کے مطابق انجام دے؟ حقیقت یہ ہے کہ تم اگرچہ عورتوں کی

''وکالت'' کا دعوی کرتے ہو مگر تمہاری وکالت غریب عورتوں کے لیے تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ ہم عورتوں کے حقیقی اور سچے حامی ہیں کہ اور پکار پکار کر ان کو سمجھا رہے ہیں کہ قدرت اور قدرت کے قانون نے تم کو جس دائرے میں محدود کر دیا ہے تو اے غریب اور شریف عورتو! اس دائرے سے باہر قدم نکالنے کی مجرم مت بنو۔

قاسم امین بک نے امریکہ کے ایک جسٹس کا قول نقل کیا ہے اور اس سے استدلال کیا ہے کہ خارجی مشاغل عورت کے منزلی فرائض میں خلل انداز نہیں ہو سکتے۔ اس کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

''عام مشاغل اور گھر سے باہر کی زندگی عورت کے منزلی فرائض میں مارج نہیں ہو سکتی، وہ مشاغل مجموعی میں بھی مشغول رہ سکتی ہے اور ساتھ ہی اس کے منزلی فرائض بھی انجام پا سکتے ہیں چنانچہ میں نے اس وقت تک اس قسم کی کوئی خبر نہیں سنی کہ کوئی شخص اپنی بیوی کا اس لیے شاکی ہوا ہو کہ وہ مصالح عامہ میں بھی شریک ہے۔'' (المراۃ الجدیدہ فصل پنجم)

لیکن ہم قاسم امین بک سے اور اس کے ہم خیال مصلحوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا امریکہ کے جج کا قول صحیح ہے؟ اور کیا یہ بھی صحیح ہے کہ تم تربیت اطفال کو ایک مشکل اور پر مشقت کام سمجھتے ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک شخص اول الذکر رائے کو صحیح تسلیم کر کے آخر الذکر رائے کی صحت کا بھی اعتراف کر لے؟ کیا ممکن ہے کہ دو اور دو ''پانچ'' بھی ہوں اور دو اور دو ''چار'' بھی؟ جواب کی امید نہیں اس لیے ہم خود ہی جواب دیتے ہیں کہ یہ سب ممکن ہے اگر یہ ممکن ہو کہ فطرت کے قوانین ''منسوخ'' ہو جائیں؟ اگر یہ ممکن ہو کہ خدا کے قرار دیے ہوئے فرائض بدل جائیں؟ اگر یہ ممکن ہو کہ مغرب مشرق ہو جائے اور جنوب شمال:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (۳۰:۳۰)

قاسم امین بک لکھتا ہے:

''ابتدائے تخلیق آدم سے اس وقت کی عورت کی مجمل تاریخ یہ ہے کہ اس پر چار دور گزرے ہیں، دور اول میں انسان بالکل ابتدائی حالت میں تھا اس لیے عورت حر مطلق اور بالکل آزاد تھی۔ پھر عائلہ کی تشکیل ہوئی، عورت کے لیے یہ دوسرا دور تھا۔ اس دور میں عورت استعباد اور مردوں کی

غلامی میں مبتلا ہوگئی اور اس کی فطرت حریت مردوں نے چھین لی، اس کے بعد تیسرا دور شروع ہوا۔ اس دور میں انسانی حالت نے کمال کی طرف ترقی کی اور تمدنی اثر آہستہ آہستہ پھیلنے لگا۔ اس لیے عورت کی غلامی نے ایک کروٹ لی اور اس کے حقوق کی طرف توجہ ہوئی لیکن مرد کی خودغرضی نے پسند کیا کہ عورت کے جن حقوق کو اس نے تسلیم کیا ہے ان سے فائدہ اٹھانے کا اس کو موقع دے لیکن چوتھے دور میں جب تمدن درجہ کمال کو پہنچا اور فطرت کے بخشے ہوئے حقوق پر انسان کی توجہ ہوئی تو عورت کے حریت نامہ کو مردوں نے تسلیم کرلیا اور مرد اور عورت کا درجہ مساوی ہوگیا۔ یہ ہے عورت کی مجمل تاریخ اور تمدن عالم کے ادوار اربعہ۔'' (المراۃ الجدیدہ فصل سوم)

فاضل مصنف نے عورتوں کی مجمل تاریخ بیان کر دی مگر یہ نہیں بتایا کہ دور اول میں وہ کس طرح آزاد تھی؟ اور دور دوم میں کس طرح استعباد اور غلامی پر راضی ہوگئی، عائلہ کی تشکیل کے ساتھ ہی عورت کا ابتدائی استقلال کیوں مفقود ہوگیا؟ اور کیوں مردوں کی غلامی سے اس نے اپنے آپ کو آزاد نہیں کیا؟ یہ وہ سوال ہیں جن پر غور کرنے کی اگر قاسم امین بک تکلیف گوارا کرتا تو اسے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک دور کے لیے ایسے اسباب اور لوازم تھے جن سے عورت کسی حالت میں بچ نہیں سکتی تھی لیکن ہم اس بحث سے الگ ہو کر صرف پہلے سوال کو دہرانا چاہتے ہیں کہ دور اول میں عورت کا کیا حال تھا اور اس کی حریت اور استقلال کی کیا صورت تھی؟ کیونکہ جب دور اول زمانہ آزادی تھا اور دور دوم میں عورت گرفتار استعباد ہوگئی اور اب پھر آزادی اور استقلال کی طالب ہوئی تو ہم کو تلاش کرنا چاہیے کہ دور اول میں عورت کی کیا حالت تھی؟ تاکہ معلوم ہو جائے کہ اب پھر اسی حالت کو تم عورتوں کے لیے کیوں پسند کرتے ہو۔ انیسویں صدی کے انسائیکلوپیڈیا کا مصنف لکھتا ہے:

''یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا پہلا زمانہ وہ تھا جب عائلہ کی بناء نہیں پڑی تھی اور عورت تمام قیود سے آزاد اور استقلال کے آخری درجہ تک پہنچی ہوئی تھی مگر استقلال کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کی حالت انتہا درجہ کی حقیر اور ذلیل تھی اور اس کی بے حد اہانت کی جاتی تھی لیکن جب عائلہ کی بنیاد پڑی تو عورت کی حالت میں تغیر ہوا اور بالکل نئی قسم کی حالت شروع ہوگئی کیونکہ عائلہ کے دائرے میں قدم رکھتے ہی درجہ استقلال سے یکایک گر پڑی اور تقیدات میں مبتلا ہو گئی مگر اس کے مقابلہ میں ایک معنوی درجہ اس نے حاصل کیا جو اس سے پیشتر مفقود تھا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ عورت دور اول میں اگر چہ آزاد اور مستقل تھی لیکن اس کی حقیر حالت اور ذلت یہاں تک پہنچی ہوئی تھی کہ جس سے زیادہ حقارت اور ذلت نہیں ہو سکتی، پھر عائلہ کی تشکیل سے استقلال مفقود ہو گیا لیکن ایک ایسا معنوی درجہ حاصل ہوا جو اس سے پیشتر اس کو میسر نہ تھا۔ عورتوں کے فرضی ''وکیل'' اس کوشش میں ہیں کہ پھر اسے آزادی اور استقلال کے درجہ پر فائز کر دیں جس کا صاف مفہوم یہ ہے کہ عورت کے معنوی درجہ چھوڑ کر دوبارہ ذلت اور حقارت کا درجہ حاصل کر لینا چاہیے، پس اگر یہ خیال صحیح ہے تو ہم سدراہ ہونے کی تکلیف نہیں گوارا کر لینا چاہتے۔ قدیم ''وحشت'' اور ''حیوانی حالت'' کا شوق ہے تو چھوڑ دو مدنیت یا دوسرے لفظوں میں ترک کر دو ''انسانیت'' کو اور پھر عورت کو اس وحشت کے میدان کی سیر کرا دو جس سے آزاد ہو کر اس نے مدنیت کا ''معنوی'' درجہ کمال حاصل کیا تھا۔

اسلام اور اسلام کی خاص ''مدنیت'' نے عورتوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ کسی مصنف، مورخ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ آج یورپ میں حد اعتدال سے گزری ہوئی آزادی نسواں نے جو نتائج پیدا کیے ہیں، ان کو دیکھ کر یورپ کے افاضل وہی طریقہ اختیار کرنا چاہتے ہیں جواب سے تیرہ سو برس پیشتر اسلام نے دنیا کو بتلایا تھا کہ اگر مسلمان اسلام کے مجموعہ تعلیم و ہدایت میں عورتوں کی حریت یا عدم حریت کے مناقشہ کا قول فیصل تلاش کریں اور ڈھونڈیں کہ اسلام نے عورت کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے؟ کہاں تک اس کو آزادی دی ہے؟ کس درجہ تک اس کے حقوق تسلیم کیے ہیں؟ غلامی اور مفرد آزادی کی خرابیوں کا کیونکر علاج کیا ہے؟ تو حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی تعلیم سے مستغنی ہو جائیں۔ ہمارے رسالہ کا موضوع اس بحث میں قدم نہیں رکھ سکتا ورنہ ہم دعوے کے ساتھ اسلام کے فیصلہ کو پیش کرتے اور بتلاتے کہ دنیا کے تمام بنائے ہوئے قانون اور انسان کے تمام بنائے ہوئے طریقے اس الٰہی اور روحانی قانون کے آگے ہیچ ہیں مگر یہاں ہم صرف اتنا بتلانا چاہتے ہیں کہ اسلام نے اس محتاج عورت کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے جس کا شوہر دنیا سے کوچ کر چکا ہو اور کوئی محافظ اور کفیل نہ ہو۔ کیا اس کو گھر سے باہر کی زندگی میں قدم رکھنا چاہیے اور کیا اس کو اپنی معاش کا انتظام خود اپنے

ہاتھوں سے انجام دینا چاہیے؟ یا اس کے لیے کسی دوسری صورت کا انتظام ہونا چاہیے؟

درحقیقت یہ ایک ضروری سوال ہے۔ قاسم امین بک نے بھی اس کو پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

''اس صورت میں عورت گھر سے باہر نکل کر اپنی ضروریات کے انتظام کرنے پر مجبور ہے اور لامحالہ اس کو آزادی اور استقلال کی اجازت دے کر منزلی دائرے میں محدود رہنے کے قانون کو توڑنا پڑے گا۔''

اسلام نے اس سوال کا جو جواب دیا ہے وہ آج ہم یورپ کے مشہور عقلاء کی زبان سے سن رہے ہیں۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق اس قسم کی محتاج اور لاوارث عورتوں کی ضروریات کا انتظام مسلمانوں کو ''بیت المال'' سے کرنا چاہیے۔ بیت المال مسلمانوں کا مشترکہ فنڈ ہے جو امیر وقت کی نگرانی میں ہمیشہ اس قسم کے محتاجوں کی مدد کے لیے تیار رہتا ہے۔ پس اسلام میں سوسائٹی یا قوم پر محتاج عورتوں کی امداد واجب کر دی گئی ہے تاکہ معاش کی ضرورتوں سے مجبور ہو کر عورتوں کو منزلی دائرے سے باہر قدم نہ نکالنا پڑے۔ یورپ کے دانشمند اکابر آج اس تعلیم پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور کوشش کر رہے ہیں کہ گورنمنٹ ان عورتو کے نفقات کا انتظام قومی فنڈ سے کر دے۔ علامہ اگسٹ کونٹ ''النظام السیاسی'' میں لکھتا ہے:

> ''شوہر یا کسی قریبی رشتہ دار کی عدم موجودگی میں سوسائٹی کا فرض ہے کہ وہ عورت کو ضروریات سے مجبور ہو کر گھر سے باہر کی زندگی میں مبتلا ہونے سے بچائے کیونکہ حتیٰ الامکان عورت کی زندگی کو منزلی دائرے میں محدود رہنا چاہیے اور ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ عورت خارجی زندگی کے مصائب اور تکلیفوں سے محفوظ رہے اور قدرت نے اس کو جس دائرے میں محدود کر دیا ہے وہ اس سے باہر نکلنے پر مجبور نہ ہو۔''

ہم مانتے ہیں کہ عورت محض غلامانہ زندگی بسر کرنے کے لیے خلق نہیں ہوئی۔ قدرت نے اس کو ایک خاص حد تک آزادی عطا فرمائی ہے اور اس کا فرض ہے کہ اس معتدل آزادی کو حاصل کرنے کے لیے مرد کا مقابلہ کرے مگر اس ہتھیار سے نہیں جو اس کے دوست نما دشمن دور سے اس کو

دکھلا رہے ہیں اور جو تمدن اور معاشرت کے میدان کارزار میں اس کو نا کام رکھنے والا ہے بلکہ اس عظیم الشان سلاح سے جو قدرت نے خاص طور پر اس کو مرحمت فرمایا اور مرد کی طاقت سے باہر ہے کہ وہ ان ہتھیاروں سے اپنی مدافعت کر سکے۔ تم جانتے ہو وہ ہتھیار کیسی عظیم الشان قوت ہے؟ ہاں تم گزشتہ فصلیں پڑھ چکے ہو، اس لیے سمجھ گئے ہو گے کہ وہ ہتھیار عورت کا اپنے فرض منصبی کی ذمہ داریوں سے واقف ہونا اور اپنے قدرتی فرائض کو انجام دینا ہے جس وقت عورت اپنے اس قدرتی سلاح سے کام لے گی تو اس کی حکومت دلوں کی سلطنت پر قائم ہو جائے گی اور وہ انسانی احساسات کی قلمرو کی ''ملکہ'' بن جائے گی۔ اس کے اختیار میں ہوگا کہ ملکی حکومت کا پانسہ جس طرف چاہے پلٹ دے اس کے ایک اشارہ میں شخصی حکومت، جمہوری حکومت میں بدل جائے گی اور اس کی ذرا سی کوشش سے سوشلسٹ اور جمہوری حکومت کا رخ خودمختار شاہی حکومت کی طرف پھر جائے گا۔ یہ تمام کامیابیاں اس سلاح کی بدولت کیونکر حاصل ہوں گی؟ جب عورت اپنی خواہش کے مطابق بچوں کی پرورش کرے گی اور ان کے دلوں پر اچھے خیالات کا نقش، نقش کالحجر کر دے گی، یہی بچے جوان ہو کر ان خیالات وامثال کو اپنا نصب العین بنائیں گے اور بڑی بڑی سلطنتوں میں انقلاب حکومت کا باعث ہوں گے اور انسان کا پہلا مدرسہ شفیق ماں کی گود ہے۔ اس مدرسہ میں زندگی کے جو اصول سکھائے جاتے ہیں اپنی آئندہ زندگی کے لیے انسان انہی کو اپنا دستور العمل قرار دیتا ہے۔

یہی ہے عورت کا ہتھیار! اور بدقسمت ہے وہ عورت جو اپنے قدرتی فرائض کو فراموش کر کے ایسے قوی اور عظیم الشان ہتھیار کو اپنے حرماں نصیب ہاتھوں سے کھو دے، کیا عورت تمدنی دنیا میں مردوں کی برابری اور ان کا مقابلہ کرنا چاہتی ہے، کیا یہ سچ ہے کہ وہ معاشی زندگی کے قدرتی مشاغل سے گھبرا گئی ہے؟ اگر یہ سچ ہے تو اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ وہ زمانہ اب بہت قریب ہے کہ جب وہ اپنے تخت سلطنت سے اتار دی جائے گی اور اس مرکز سے دور کر دی جائے گی جس پر قائم رہنا اس کے لیے تمام انسانی سعادتوں اور حقیقی آزادی کا مبداء تھا۔

یہ قدرتی سلاح عورت کو اسی حالت میں مل سکتا ہے جب وہ سیکھے کہ ماں بننے کی صلاحیت کیونکر حاصل ہو سکتی ہے؟ وہ اپنے قدرتی فرائض کے قوانین پر نظر ڈالے اور تربیت کے ان اسرار اور عجائبات

کا غور سے مطالعہ کرے جو بزدل کو بہادر، بخیل کو صاحب کرم، شخصی حکومت کے شیدا کو جمہوری حکومت کا شیفتہ اور سوشلسٹ حکومت کے عاشق کو خود مختار شاہی حکومت کا فدائی بنا دیتے ہیں۔

صحیفہ فطرت، علمی دلائل اور علمائے یورپ کے اقوال بآواز بلند دعویٰ کر رہے ہیں کہ عورت خواہ کتنی ہی کوشش کرے اور آسمان ہفتم کے تارے توڑ لائے مگر جسمانی اور عقلی قوت کی سطح پر مرد کی برابری نہیں کر سکتی۔ غلطی اور سخت غلطی ہوگی اگر اس دعویٰ کا یہ مفہوم سمجھا جائے کہ عورت بالفطرت اس لیے کمزور بنائی گئی ہے کہ وہ ہمیشہ دنیا میں زیردست رہے اور مرد اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھائے۔ عورت کو جس غرض سے دنیا میں خلق کیا گیا ہے، وہ نسل انسانی کی بقا اور اس کی کثرت ہے۔ اس قدرتی امر کی انجام دہی میں اس امر کی ضرورت نہ تھی کہ عورت کو تمدنی دنیا میں زیادہ بلند کیا جاتا۔ اس کام کے لیے مرد خلق کیا گیا اور نامعلوم زمانے سے وہ اپنے فرض کو انجام دے رہا ہے۔ عورت کو وہ قوتیں عطا کی گئیں جو اس کے قدرتی فرض کی انجام دہی میں مدد دیں اور مرد کو جسمانی اور عقلی قویٰ کی وہ طاقت بخشی گئی جو اس کے تمدنی فرائض کی بجا آوری میں ممد ہوں۔ پس اس حیثیت سے دونوں جنسوں کا درجہ مساوی ہے اور دونوں نظام کائنات میں برابر کا حصہ رکھتے ہیں لیکن چونکہ عورت کا قدرتی فرض اس امر کے لیے مستلزم ہے کہ مرد کے ماتحت رہ کر اس کی معنوی خاصیت نشوونما پائے۔ اس لیے عورت کو اس کی بہتری اور ترقی کے لیے یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ وہ پوری طرح مرد کے زیر اثر رہے۔ یہی وہ اطاعت اور ماتحتی ہے جس کو ''اسلام'' کے ''مجموعہ قوانین'' نے ذیل کی دفعہ میں ظاہر کیا ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاۗءِ (۴:۳۴)

''عورتیں مردوں کے زیر اثر ہیں۔''

اگر عورت مرد کی اس قدرتی اطاعت کو قبول نہیں کرے گی تو اس کو مجبوراً منظور کرنا پڑے گا۔ بیرونی زندگی کے جس قدر کاروبار ہیں ان میں ایک کام بھی ایسا نہیں ہے جس میں عورت مرد کا مقابلہ کر سکے۔ اس خطرناک معرکہ میں غلبہ حاصل کرنے کی پہلی شرط جسمانی قوت، جفاکشی اور مختلف آلام و مصائب کو برداشت کرنے کی ہمت اور طاقت ہے اور یہی وہ شرط ہے جس سے عورت کا کچکول خالی نظر آتا ہے۔ دنیا کی قدیم ترین تاریخ کی ورق گردانی کر دتم کو زمانہ معلومہ کی

ابتداء سے لے کر اس وقت تک کوئی زمانہ ایسا نہیں ملے گا جس میں عورت مرد کی مطیع ومنقاد نہ رہی ہو۔ دنیا میں ہمیشہ مرد کی حکمرانی رہی ہے اور کبھی عورت نے مرد پر غلبہ نہیں پایا ہے۔ یہ امر اس کا قدرتی ثبوت ہے کہ کارکنان قدرت نے عورت کی پیشانی پر سرنوشت اطاعت لکھ دیا ہے کیونکہ ''ورڈ آف گارڈ'' اور ''ورک آف گارڈ'' کبھی باہم مختلف نہیں ہوسکتے۔ دنیا کی یکساں اور غیر متغیر حالت ورڈ آف گارڈ کا حکم رکھتی ہے اور مسلسل واقعات لسان فطرت بن کر بتلاتے ہیں کہ قدرت کا مقصود کیا ہے؟ پس کون ہے جو لسان فطرت کی مخالفت کرسکتا ہے؟

ہاں ''خیالی فلسفہ'' چاہتا ہے کہ قوانین قدرت میں تغیر ہو۔ کمزور زورآور پر غالب آ جائے اور محکوم حکمرانی کی خواہش میں کامیاب ہو مگر قدرت کے اٹل قوانین، بالاتر از عقل انسانی زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ خیالی فلسفہ ہزار کوشش کرے مگر ناکامیابی کا داغ اس کی پیشانی سے محو نہیں ہوسکتا۔ وہ قوانین قدرت کے مقابلہ میں ہمیشہ ناکام رہا اور ہمیشہ ناکام رہے گا۔ کیا خیالی فلسفہ نے کمزور قوموں کو طاقتور اقوام کے پنجوں سے چھڑانے کی کوشش نہیں کی؟ کیا ایک طاقتور آدمی سے اس بات کا مطالبہ نہیں کیا کہ وہ کیوں اپنے زبردست اور کم طاقت بھائی کے ساتھ ہر حیثیت میں مساوی ہونے کے لیے تیار نہیں ہے؟ کیا اس نے دنیا کو اس خیال کی دعوت دینے میں کوئی کسر اٹھا رکھی کہ طاقتور افراد کو ''قانون مساوات'' پر عمل کر کے اپنے اعلیٰ اور افضل مرتبوں کو خیرباد کہہ دینا چاہیے مگر ان کوششوں کا انجام کیا ہوا؟ فلسفہ تاریخ بتلا رہا ہے کہ عالم کائنات کے وہ اسرار جن کو حکومت الٰہی نے اعمال انسانی پر حکمران بنایا ہے ایک منٹ اور ایک پل کے لیے بھی متغیر نہ ہوئے۔ قوانین قدرت کا تسلط اپنی پوری قوت اور طاقت کے ساتھ دنیا پر قائم رہا اور خیالی فلسفہ کے داعی ناکامی کا داغ ناقابل عمل فلسفہ کی طرح اپنے ساتھ قبروں میں لے گئے۔

تم نوع انسانی کے چند ضعیف افراد ہو۔ قوانین قدرت کا مقابلہ کرنے کی جرات کرتے ہو تو اپنی قدرت کا بھی اندازہ کرلو۔ کیا قدرت تمہاری خواہش کی پابند ہے؟ کیا قدرت تمہارے اشاروں کے مطابق چلنے پر مجبور ہے؟ صاف صاف بتلاؤ۔ تم نے قدرت کے عجائبات کو کیا سمجھا ہے؟ قدرت دنیا کی آسائش اور انتظام پر نظر رکھے یا تم ایسے چند ضعیف افراد کی خواہش پر؟ عالم کائنات جس روش پر چل رہا ہے، ہمیشہ اسی روش پر چلے گا۔ اگر تم اس روش کو پسند نہیں کرتے تو درو

دیوار کی قوت جذب و دفع سے اپنے خبط کا علاج کرو۔

قوانین قدرت کا مکتبہ شناس اور استاذ الاساتذہ علامہ "اگسٹ کونٹ النظام السیاسی علی حسب الفلسفته الحسیه" میں لکھتا ہے:

"ہم بغیر اس کے کہ عورتوں کی آزادی کے ناممکن الحصول خیالی ہنگاموں کو توڑنے کی قانون قدرت کی قدر شناسی تکلیف گوارا کریں۔ نظام حقیقی اور قانون قدرت کی قدر شناسی کے لیے ہم پر سب سے پہلے اس بات کا احساس کرنا فرض ہے کہ اگر کسی زمانہ میں عورتوں کو وہ دماغی مساوات حاصل ہو جائے جس کو اس کے خواہ مخواہ کے ہمدرد اور وکیل طلب کر رہے ہیں تو صرف عورتوں کی اخلاقی حالت ہی کو صدمہ نہیں پہنچے گا بلکہ سوسائٹی کے قیام و انتظام کے لیے عورت کی جو ذمہ داری قدرت نے مقرر کی ہے وہ بھی ٹوٹ جائے گی کیونکہ ایسی حالت میں عورت کو روزانہ قومی مزاحمتوں کے پیش آ جانے کی وجہ سے اکثر کاموں میں اپنی عاجزی سے تنگ آ جانا پڑے گا اور معاشرت اور تمدن کے نہایت ضروری اعمال انجام نہ پا سکیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشرت کی دلفریبی مصائب و آلام سے مسخ ہو جائے گی۔ منزلی زندگی کی شیرینی میں تلخی پیدا ہو جائے گی۔ مرد اور عورت کی باہمی اور مشترک محبت کا صاف سرچشمہ مکدر ہو جائے گا اور کشاکش کائنات میں یہ دونوں جنسیں آج جس طرح مل جل کر مسرت بخش زندگی بسر کر رہی ہیں بالکل مفقود ہو جائے گی۔"

ہم سے پہلے بھی دنیا میں ایسی قومیں گزر چکی ہیں جن پر اسی قسم کے خیالات محیط ہو گئے تھے۔ انہوں نے قوانین قدرت کی تعلیم سے روتابی کی تھی اور خدا کے بتائے ہوئے حدود کو توڑنا چاہا تھا مگر اس انحراف کا یہ نتیجہ ہوا کہ سوسائٹی میں ایسے رنج دہ اور برباد کن نتائج پیدا ہو گئے جنہوں نے ان کو رفتہ رفتہ برباد کر دیا اور اس طرح سے نام و نشان کر دیا کہ آج ہم ان کے وجود سے بھی بے خبر ہیں۔ فلسفہ تاریخ نے اسی قسم کے تاریخی شواہد اور گذشتہ امم کے حوادث کو ایک عملی استقرار قرار دیا ہے جس کے پیش نظر ہونے کے بعد ممکن نہیں کہ خیالی فلسفہ کی دلفریبی سے طبیعت متاثر ہو۔

''علامہ دوفاریئی'' انسائیکلوپیڈیا میں لکھتا ہے کہ:

''ہمارے زمانے میں عورتوں کی خیر خواہی اور ان کی حالت کی اصلاح کے متعلق جو تحریک شائع ہو رہی ہے یقیناً اس کا انجام یہی ہوگا کہ اس عام تجربے کی تصدیق ہو جائے گی۔ نوع انسانی دنیا کے ہر ایک گوشہ میں ایک عرصہ دراز تک ایک ایسے طرز معاشرت کی زندگی بسر کرتی رہی ہے جو اس سوسائٹی کی حالت سے بھی زیادہ حقیر اور ذلیل تھی جس کی وجہ سے آج عورتوں کی حالت زار پر آنسو بہائے جاتے ہیں مگر قرون وسطیٰ سے ترقی یافتہ قوموں کی سوسائٹی بتدریج اس حالت سے نکلنے لگی اور رفتہ رفتہ قدیم ذلت اور حقارت سے پاک ہوگئی کیونکہ سوسائٹی کی خرابی ایک ایسی عارضی حالت تھی جس کو گزشتہ زمانہ جہالت کے اثرات نے پیدا کر دیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں حاکم اور محکوم کا امتیاز کسی عضوی مسئلہ پر مبنی نہیں تھا یعنی جیسا تعلق مرد اور عورت میں ہے کیونکہ ان میں باہمی عضوی اختلاف ہے۔''

اس کے بعد مرد اور عورت کے باہمی معاشرتی تعلقات کے متعلق لکھا ہے:

''مگر مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی اطاعت شعاری ایک ایسی چیز ہے جس کی اور تمام باتوں کے برعکس کوئی حد نہایت نہیں قرار پا سکتی وہ بتدریج عام اخلاقی ترقی کے ساتھ موافقت کرتی رہی کیونکہ اس کا تعلق براہ راست عورت کے اس طبعی ضعف سے ہے جس کا تدارک ممکن نہیں۔ عورت کی یہ قدرتی کمزوری ''علم الحیات'' (بیالوجی) کے اصول و تجارب اور روزمرہ کے معاشرتی مشاہدات سے ثابت ہو چکی ہے اور اس درجہ مسلم ہے کہ اس سے انکار کرنا اصول علمی سے انکار کرنا ہے۔ ''علم الحیات'' تشریحی اور فزیالوجی اصول کی بناء پر نہایت وضاحت کے ساتھ بتلاتا ہے کہ حیوانی سلسلہ میں عام طور پر اور انسان میں خاص طور پر مادہ (جنس اناث) کی ترکیب بچوں کی اصلی حالت سے بے حد مشابہت رکھتی ہے اور یہی حالت عورت میں اپنے مدمقابل (جنس رجال) کی ترکیب عضوی سے کم درجہ رکھتی ہے۔''

نوع انسانی کے چند ضعیف اور ذلیل افراد اور فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۱۲:۱۰۱) کے مقرر کیے ہوئے قانون میں ایک عجیب و غریب لڑائی جاری ہے۔ یہ ضعیف انسان اس کے بنائے ہوئے قانون کی پروا نہیں کرتا۔ اس کو نظر حقارت سے دیکھتا ہے اور اس کی مخالفت پر

آمادہ ہے مگر قانون قدرت کی مستحکم اور اٹل حکومت عالم کائنات پر محیط ہے اور اپنے اصولوں پر قائم ہے۔ وہ اپنے مدمقابل کی اس حریفانہ جرات کو بعینہ اسی طرح دیکھ کر ہنس رہی ہے جس طرح ایک تجربہ کار بوڑھا کسی شیر خوار بچے کو نیر اعظم کی شعاعوں کی مخالفت پر آمادہ دیکھ کر مسکرا دیتا ہے۔ یہ ضعیف اور اسرار قدرت سے بے خبر انسان عورت کے قدرتی ضعف کو اپنی مادی اور مصنوعی کوشش سے دور کرنا چاہتا ہے اور مرد کا مدمقابل بنانا چاہتا ہے مگر قدرت اپنے قانون اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (۳۴:۴) پر نہایت استحکام اور مضبوطی سے قائم ہے اور اپنے ذلیل حریف کو کوشش اور سعی کے تمام ارمان نکال لینے کا موقع دے رہا ہے۔ عالم کائنات میں ذرہ سے لے کر عظیم الشان مخلوقات دے رہا ہے۔ عالم کائنات میں ذرہ سے لے کر عظیم الشان مخلوقات تک کوئی ہستی اس دعویٰ کی جرات کر سکتی ہے کہ یہ ضعیف انسان قانون قدرت کے معاملہ میں کامیابی حاصل کرے گا؟ کیا کوئی ایک پل کے لیے بھی یقین کرے گا کہ ضعیف انسان کی کوشش قانون قدرت کی حکومت کو متزلزل کر دے گی۔ کون ہے جو ایسا یقین کر سکتا ہے اور اپنی دیوانگی اور جنون کا قطعی ثبوت دے سکتا ہے:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (۳۰:۳۰)

میڈم ''ہیر کور'' کی کوششوں سے علمی دنیا بے خبر نہیں ہے۔ اس نے عورتوں کے حقوق کی حفاظت کا بیڑہ اٹھایا تھا اور مردوں کو دھمکایا تھا کہ عنقریب اس کی کوششیں کامیاب ہو کر عورت کو غالب کر دیں گی لیکن جب اس نے مشہور سوشلسٹ فلاسفر علامہ پرودُن سے بذریعہ تحریر دریافت کیا کہ مسئلہ حقوق نسواں کے متعلق اس کی کیا رائے ہے تو علامہ مذکور نے ایک تفصیلی جواب دے کر اس کے تمام دعوؤں اور مساوات حقوق کے سارے ہنگاموں کی قلعی کھول دی۔ غور سے سنو! مذکور لکھتا ہے کہ:

> ''میرے خیال میں عورتیں اپنی آزادی کی کوششیں کر رہی ہیں۔ یہ ایک نری دیوانگی ہے جو افسوس ہے کہ اس جنس کو لاحق ہو گئی ہے، عورتوں کی یہ علت اس امر کا بین ثبوت ہے کہ اب ان میں اپنی قدر پہچاننے اور بطور خاص اپنے معاملات کو انجام دینے کا مادہ ہی نہیں رہا۔''

پھر اس کے بعد یہ محرم راز اسرار قدرت علمی دلائل سے اپنی رائے کو تقویت دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ:

''عورتوں اور مردوں میں جنسیت کا جو فصل پایا جاتا ہے وہ ان دونوں جنسوں کو مساویانہ صورت میں الگ نہیں کرتا بلکہ باہمی مشابہت کے ساتھ انہیں قوت اور ضعف کے اہم اختلافات کے پیش نظر ایک دوسرے سے کر دیتا ہے۔ جو حیوانات کی نوعوں اور جنسوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ پس اس اختلاف اور فصل کی وجہ سے عورت اور مرد کا ہم شریک بن کر رہنا ناممکن اور محال قطعی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ عورت کا وجود مرد کے تعلق سے اثبات وجود کرتا ہے اور خود اس میں اتنی قوت نہیں ہے کہ مستقل حیثیت سے اپنے وجود کو قائم رکھ سکے۔ عورت کو ہم اگر ملکی اور وطنی سمجھتے ہیں تو صرف اس تعلق کی بناء پر کہ وہ ایک وطنی مرد کی بیوی ہے مثلاً ہم کسی جمہوریت کے پریسیڈنٹ کی بیوی کو اس لیے پہچانتے ہیں کہ وہ پریسیڈنٹ کی بیوی ہے لیکن اس رائے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عورت دنیا میں ایک بے کار چیز ہے جو عالم کائنات میں کسی قسم کا حصہ نہیں لے سکتی کیونکہ قدرت نے اس کے ذمہ ان کاموں سے زیادہ اہم اور زیادہ باعظمت کام مقرر کر دیے ہیں جو مرد تمدنی دنیا میں انجام دیا کرتا ہے بلکہ میری اصل غرض یہ ہے کہ چونکہ تمدنی مشاغل میں شرکت اس کے فرض منصبی کا نقیض ہے اس لیے اس کے دماغی اور جسمانی قوئ کو تمدنی اعمال کے انجام دینے کی طاقت قدرت نے نہیں بخشی۔''

اس کے بعد سوشلسٹ فیلسوف نے اپنی تمام آراء کا خلاصہ ذیل کی سطروں میں لکھ کر اس بحث کا خاتمہ کر دیا ہے۔ انتہائے دیوانگی اور جنون کا نمونہ ہے وہ شخص جو ان سطروں سے متاثر نہ ہو:

''خلاصہ یہ ہے کہ میں اس بات پر پوری قوت سے آمادہ ہوں کہ مشاہدات و براہین اور تجارب سے ثابت کر دوں کہ جس طرح عورت قوت میں مرد سے بدرجہا کم ہے، اسی طرح کاروباری دنیا، اخلاقی میدان اور عالم فلاسفہ میں بھی مرد سے بہت پیچھے ہے اور قدرت کا مقصود ہی یہی ہے کہ ہمیشہ پیچھے رہے۔ پس اگر عورت نے وہ اقتدار حاصل کر لیا ہے جس کے لیے تم کوشش کر رہے ہو اور وہ مرد کے مقبوضات میں داخل ہو گئی تو اے میرے عزیز دوست اچھی طرح سمجھ لو کہ پھر عورت کا معاملہ حد سے گزر جائے گا اور صاف بات یہ ہے کہ وہ

''استعباد اور غلامی'' میں گرفتار ہو جائے گی۔''

یاللاسف کیا ایسے قطعی اور علمی احکام کو سن کر بھی تم عورتوں کو آزادی دلانے کی مہلک سعی سے باز نہیں آؤ گے۔ کیا علامہ پروڈن جیسے نکتہ شناس قوانین الٰہی کی تحریر اس امر کا قطعی ثبوت نہیں ہے کہ فطرت اور علم صحیح تمہارے وہمی خیالات کے بالکل مخالف ہیں؟ کیا ابتکار النظام کے جید مصنف نے صاف صاف نہیں کہہ دیا کہ مساوات حقوق کی مترادف قوانین کو توڑنے کے مترادف ہے؟ کون ہے جو جواب نفی میں دے سکتا ہے؟ اور کون ہے جو جنوب کو شمال اور مغرب کو مشرق بتلا سکتا ہے؟ ہاں بیشک آزادی نسواں اور مساوات حقوق کا خیال قوانین الٰہی کی عظمت کا مقابلہ ہے۔ تم قوانین فطرت کا مقابلہ کرنا چاہتے ہو مگر افسوس ہے کہ یہ نہیں بتلاتے کہ تم کون ہو اور تمہاری ہستی کیا ہے؟

ہاں ہم کو معلوم ہے کہ تم کون ہو اور تمہاری ہستی کیا ہے؟ تم ذلیل اور ضعیف انسان ہو، سرکش ہو اور مغرور ہو۔ ناقص علم کے نشہ نے تم کو سرشار کر دیا ہے اور خیالی فلسفہ کی غفلت سے تم مدہوش ہو گئے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ قوانین الٰہی کے سمندر کو ہم نے طے کر لیا ہے حالانکہ تم ابھی اس کے کنارے تک بھی نہیں پہنچے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ حقائق اشیاء کے لق و دق میدان کا ہم نے کونہ کونہ چھان مارا ہے حالانکہ تم نے ابھی اس کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی ''نیوٹن'' دریائے علم کے کنارے پر اپنے آپ کو ایک بچہ سمجھتا ہے مگر تم کو وہم و جنون نے یقین دلا دیا ہے کہ تمہارے قدم اس کی تہہ تک پہنچ گئے ہیں۔ ''بیکن'' اپنے آپ کو میدان حقائق میں ایک سنگریزہ سمجھتا ہے مگر غرور اور سرکشی نے تم کو اس وہم میں ڈال دیا ہے کہ تمہاری آنکھوں میں اس کے ذرے ذرے کا عکس موجود ہے۔ تم اپنی ذلیل اور حقیر ہستی کو بھول گئے ہو اور وہم و غرور کی خوشامد نے تم کو ایک خطرناک دھوکہ میں ڈال دیا ہے۔ آہ! تم فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۴۶:۳۹) کا قوانین کے مقابلہ کرنا چاہتے ہو حالانکہ تمہاری ہستی ضعیف ترین، تمہاری معلومات محدود اور تمہارا مبلغ علم بالکل ناقص ہے۔ تمہاری مثال عالم کائنات کے اسرار و عجائبات کے مقابلہ میں (بقول بیکن) ایسی ہے جیسے نیر اعظم کی شعاع کسی ناچیز ذرے کو درخشاں کر دے اور وہ اپنی چمک سے مغرور ہو کر اس عظیم الشان ہستی سے مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے ''علم'' ایک فضائے بسیط ہے جس میں ہزاروں اور لاکھوں

ستارے موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ تم نے تو ابھی لاکھوں میل کے فاصلے سے صرف ایک چھوٹے ستارے کی جھلک دیکھ پائی ہے اور اس پر اس قدر مغرور ہو گویا اس فضائے علم کا ذرہ ذرہ تمہارے دماغ میں موجود ہے۔ ابھی لاکھوں ستارے ہیں جن کو نہ تمہاری آنکھوں نے دیکھا ہے اور نہ تمہارا ظرف اس باعظمت وجود کے نظارہ کا متحمل ہو سکتا ہے۔ ''علم علم'' کے نعرے لگا کر دنیا کی علمی مصروفیت اور تمدنی سکون میں خلل ڈال رہے ہو۔ بتلاؤ تم نے علم کس چیز کو سمجھا ہے وہ کون سا علم ہے جس نے تم کو سرکش اور مغرور بنا دیا ہے اور وہ کون سے معارف ہیں جن کو نخوت نے تم کو قانون الٰہی کی مخالفت کی باغیانہ جرأت دلا دی ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ تم نے حرارت کے چند طبعی قوانین کا پتہ لگا لیا ہے۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے قانون کشش اجسام کو ایک اضطراری واقعہ کی بناء پر دریافت کر لیا ہے تو کیا یہی وہ معارف ہیں جن کی دریافت کا غرور تم کو قدرت کے مقابلہ کے لیے تیار کر رہا ہے۔ کیا اسی قسم کی وہ تحقیقات ہیں جن کی وجہ سے تم اپنے آپ کو اسرار کائنات کا محرم سمجھتے ہو۔ اگر یہ سچ ہے تو تم کو سمجھ لینا چاہیے کہ تمہارے علم پر جہل ہنس رہا ہے اور تمہاری معلومات کو بے خبری نظر حقارت سے دیکھ رہی ہے۔ تمہارا علم اسرار کائنات کے مقابلہ میں اس سے بھی زیادہ حقیر ہے، جس قدر تم معلم اول کے مقابلہ میں ایک چیونٹی کے دماغ کو سمجھتے ہیں۔ تمہارا وہ ذہن جس کو تم انسان کی ذہنی ترقی کا انتہائی درجہ سمجھتے ہو تمہاری بربادی کا باعث ہوگا اور تمہارا وہ وجود جس کو تم انسان کے لیے طرہ افتخار یقین کرتے ہو، اشرف المخلوقات کے لیے ننگ و عار ثابت ہوگا۔ کاش! تم کو معلوم ہوتا کہ تم کس قدر حقیر اور ذلیل ہو۔ کاش تم سمجھتے کہ قانون الٰہی کے تم کتنے بڑے مجرم ہو، آہ! تم ''باغی'' ہو اور نہیں جانتے کہ جرم بغاوت کس سزا اور عتاب کا مستحق ہے؟ آہ! تم خدا کے قائم کیے ہوئے حدود کو توڑنا چاہتے ہو اور نہیں سمجھتے کہ بغاوت اسی کا نام ہے۔ تم اسرار کائنات کے بے انتہا خزانوں کا ایک حقیر موتی پا کر مغرور ہو گئے ہو اور سمجھتے ہو کہ ہم کائنات کے تمام علوم اور قوانین پر حاوی ہو گئے ہیں حالانکہ تمہارا ظرف ان کی ایک جھلک دیکھ لینے کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا۔ تم ''اہرام مصر'' کے بانیوں کو بھول گئے ہو۔ تم نے ''معلم اول'' کی قوم اور ملک کو فراموش کر دیا ہے۔ یہ تو وہ قوانین ہیں جنہوں نے تہذیب و شائستگی کے میدان میں تمام دنیا کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا تھا اور علوم حکمت پر تنہا قابض ہو گئے تھے۔ انہوں نے بڑی بڑی تحقیقات کیں،

عظیم الشان عمارتیں تیار کیں اور فلسفہ وحکمت کا بنیادی پتھر نصب کیا لیکن آج وہ قومیں کہاں ہیں؟ دنیا کے کس کونے میں چھپی بیٹھی ہیں؟ ''ہیروڈوٹس'' کو بلاؤ۔ وہ دنیا کا ایک چکر لگائے۔ منطقہ باردہ سے منطقہ حارہ تک کا سفر کرے اور ہرمان کے بانیوں کو تلاش کرے اور ہم کو بتلائے کہ وہ باعظمت وجود کیوں اب دنیا کو اپنی صورت نہیں دکھلاتے؟ ابوالہول کی آنکھیں ان کے انتظار میں پتھرا گئی ہیں اور ''مدفن ازیروس'' ان کے بغیر وحشت کدہ بن رہا ہے۔ ہاں ''ہیروڈوٹس'' سے پوچھو کہ ''ابوالحکمت'' اب دنیا سے کیوں ناراض ہو گئے ہیں؟ ''کوہ المپس'' کی چوٹیاں بلند ہو ہو کر ان کو تلاش کر رہی ہیں اور یونان کی شہزادی ''آتھنس'' ان کے انتظار میں مریخ اور مشتری کے مظالم سہہ رہی ہے۔ آہ! ''ہیروڈوٹس'' کی دنیا ہلاک ہوگئی۔ اب اس کی خبر دنیا کو نہیں مل سکتی۔ ''ابوالہول'' انتظار کرتے کرتے فنا ہو جائے گا اور یونان کی شہزادی آسمانی دیوتاؤں میں مدغم ہو جائے گی مگر ان قوموں کا کچھ سراغ نہیں ملے گا۔ وہ وہاں پہنچ گئی ہیں جہاں سے نہ ان کی خبر آسکتی ہے اور نہ ہماری خبر ان کو پہنچ سکتی ہے مگر آہ! تم نہیں سوچتے کہ اس عظمت و جبروت کی قومیں کیوں عالم کائنات سے ہمیشہ کے لیے جدا کر دی گئیں۔ یہ علوم وفنون کا مخزن تھیں اور تہذیب وشائستگی کی بانی تھیں پھر انہوں نے کونسا ایسا قصور کیا جس کی پاداش میں ان کا نام صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ تم اپنی تاریخی معلومات سے مدد لو۔ ''آجپٹالوجی'' (مصریات) کے آثار ونتائج کا مطالعہ کرو اور ''کالڈیا'' کی اینٹوں کے نقوش کو پڑھنے کی کوشش کرو۔ تم کو معلوم ہو جائے گا کہ انہوں نے قوانین قدرت کی الٰہی حکومت سے بغاوت کی تھی اور فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (۴۶:۳۹) کے اختیارات کو نظر حقارت سے دیکھا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرائم کے نتائج جراثیم بن کر قوم اور سوسائٹی کے عضو میں سرایت کر گئے اور تنزل اور ترقی کا قانون رفتہ رفتہ اپنے اختیارات سے کام لینے لگا۔ آسمان گرد آلود ہو گیا اور غلیظ ابر کی چادر نے نیلے رنگ کے خوش منظر گنبد کو چھپا لیا۔ وہی قومیں جن کی شوکت ترقی، تہذیب اور شائستگی کا اعلیٰ ترین نمونہ نہ تھی حیرت انگیز طریقہ سے برباد و ہلاک ہوگئیں اور آن کی آن میں ان کی تمدنی املاک دوسری قوموں کے قبضہ میں نظر آنے لگیں۔ اہرام کا سر بفلک دیو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان کو تلاش کر رہا ہے۔ ابوالہول کی آنکھیں ان کے انتظار میں سفید ہوگئی ہیں اور المپس کی چوٹیاں ان کی تلاش میں ہزاروں قرنوں سے آفات سماوی کا مقابلہ کر رہی

ہیں مگر یہ قومیں اسطرح نابوداور معدوم ہوگئی ہیں کہ دنیا کے کسی کونے سے ان کی آواز نہیں آتی اور عالم کائنات ان کا نشان بتانے سے عاجز آ گیا ہے۔

تم ان قوموں کے حالات سے عبرت پکڑو۔ان کی ترقی کو دیکھو پھران کے تنزل کے صفحات کا مطالعہ کرو۔تہذیب وشائستگی کے لحاظ سے یہ قومیں اپنی دنیا میں وہی درجہ رکھتی تھیں جو آج مشرق کی تاریکی کی بدولت تم کو حاصل ہے مگر فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۴۶:۳۹) کے اٹل قوانین کی سرتابی نے ان کو چشم زدن میں برباد کردیا اور اس طرح نابودومعدوم ہوگئیں۔گویا دنیا میں ان کا کبھی وجود ہی نہ تھا۔تم فراعنہ کے قدیم دارالحکومت کی سیاحت کرتے ہو۔اہرام مصر کی نہایت غوروفکر سے پیمائش کرتے ہو۔تم نہیں سنتے کہ رزیسیس کے تخت گاہ کا چپہ چپہ زبان حال سے کیا کہتا ہے؟ تم نہیں سنتے کہ اہرام کی چوٹیاں اپنے نظارہ کرنے والوں سے رورو کر کیا کہتی ہیں؟ آہ! وہ اپنے رہنے والوں کے جانگداز قصے سناتا ہے اور یہ اپنے بنانے والوں کی دردانگیز سرگذشت سناتی ہیں۔وہ اپنے دیکھنے والوں کو زبان حال سے نصیحت کرتا ہے کہ:

''جن قوموں کے تلے مجھے رہنے کا شرف حاصل ہو چکا ہے ان کی عظمت اور شوکت کا ثبوت میری پامال زمین کا چپہ چپہ دے رہا ہے مگر قوانین الٰہی سے بغاوت نے ان کی عظمت کو ذلت اور حقارت سے مبدل کردیا ہے اوران کی ترقی تنزل سے مرعوب ہوگئی۔آج مصر کے عتیق خانے میں جاکران کی پرہیبت صورتوں کا نظارہ کرلو کس قدوقامت کے لوگ تھے او رکیسی کیسی عظیم عمارتیں ان کے قوی ہاتھوں نے تیار کی تھیں لیکن آج عالم کائنات کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ان کا کوئی نام لیوا بھی نظر آتا ہے؟ یہ کیوں ہوا؟ صرف اس لیے کہ نفرت اور غرور نے ان کی گردنوں کو قوانین الٰہی کی طرف سے موڑ دیا اور خدا کے قائم کیے ہوئے حدود کو انہیں نے نظر حقارت سے دیکھا نظر اغماض سے مجھ کو دیکھنے والو! کہیں تم بھی ان کی طرح اپنے ہاتھوں برباد اور ہلاک نہ ہوجانا۔''

اسی طرح فراعنہ کا منارۂ عظمت اپنے نظارہ کرنے والوں کو نصیحت کرتا ہے کہ:

''میرے بنانے والے تم سے زیادہ قوی اور طاقتور تھے مگر قوانین الٰہی کے احکام کے آگے

انہوں نے نخوت اور تکبر سے سر نہیں جھکایا۔ آہ! ان کی قوت اور طاقت خاک میں مل گئی اور وہ ہمیشہ کے لیے دنیا سے نابود کردی گئی۔''

زمانہ حیران ہے کہ ان عظیم الشان مناروں کے بنانے سے بانیوں کا مقصد کیا تھا؟ ''رولن ہرمان'' کو فراعنہ کا مدفن سمجھتا ہے اور مصریوں کی فضول خرچی اور اسراف کو نہایت حقارت اور ذلت کی نظر سے دیکھتا ہے مگر افسوس ہے کہ وہ اصل حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ دیدہ عبرت سے ان میناروں کو دیکھو یہ اپنے بنانے والوں کا مقصد زبان حال سے کہہ رہے ہیں:

''ہم اس صحرائے منقش میں اس لیے کھڑے کیے گئے ہیں کہ آنے والی قوموں کو اپنے بنانے والوں کی عبرت انگیز داستان سنا سنا کر نصیحت کریں اور حکومت الٰہی سے بغاوت کرنے کا مہلک نتیجہ دنیا کے سامنے پیش کردیں۔ مبارک ہیں وہ جو ہماری آواز پر کان دھرتے ہیں او رچشم عبرت سے ہمارے مجسم نصیحت وجود کو دیکھتے ہیں۔''

ہمارے رسالے کی گزشتہ فصلوں سے تم کو بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئی ہوں گی۔ عام خیال یہ ہے کہ یورپ کی جدید علمی ترقی مرد اور عورت کو ایک نظر سے دیکھتی ہے مگر فرید وجدی کی زبانی تم کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ آج یورپ کے نام سے جس قدر غلط باتیں مشرق میں مشہور ہیں ان میں سے اس دعوے سے بڑھ کر اور کوئی خیال غلط بے سروپا اور کذب محض نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مردوں کے تشدد اور ظلم نے غریب عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں مقید کردیا ہے۔ گزشتہ صفحات نے تم پر ثابت کردیا ہوگا کہ مردوں نے نہیں بلکہ خود عورت نے عورتوں کی زندگی کو منزلی دائرے میں محدود کردیا ہے۔ ہمارے رسالے کی گزشتہ فصلوں کی بدولت یورپ کے جن مشاہیر علماء کی خدمت میں تم کو باریابی کا شرف حاصل ہوا ہے ان میں سے ہر ایک عالم علم وکمال کے دربار کا صدر نشین ہے۔ تم کو اس وقت تک وہ باعظمت مجلس یاد ہوگی جس میں ایک طرف ژول سیماں، دوسری طرف ڈوٹر ویشہ (Outer Cheat) سامنے کرسی صدارت پر ''اگسٹ کونٹ' جیسے رؤساء فلاسفہ اور مجتہدین علوم جدیدہ رونق افروز تھے۔ تم کو وہ موثر گھڑی اب تک نہ بھولی ہوگی جب ژول سیماں کی

ہنگامہ خیز تقریر نے قاسم امین بک'' کے تمام دعووں کی قلعی کھول دی تھی۔ وہ آسمان علم کا آفتاب ہے، وہ فلسفہ وحکمت کا افضل ترین معلم ہے۔ تم کو وہ منظر بھی یاد ہوگا جب صدر مجلس اگسٹ کونٹ کے یادگار لیکچر نے ''فزیالوجی'' اور ''سائیکالوجی'' کی مسلم تحقیقات کو پیش کر کے عورتوں کے فرضی وکیلوں کے تمام دعووں پر پانی پھیر دیا۔ ممکن نہیں کہ تم اس عجیب منظر کو بھول جاؤ۔ ہاں! وہ یورپ کا استاذ الاساتذہ ہے۔ وہ فلسفہ حسی کا مجدد اور موسس ہے۔ تم کو قاسم امین بک کی وہ صورت بھی یاد ہو گی جن پر صدر مجلس کی تقریر نے ناکامی اور خجالت کے اثرات پیدا کر دیئے تھے۔ تم کو فرید وجدی کا وہ بشاش چہرہ بھی یاد ہوگا جو زیر لب خندہ سے اپنے ناکام حریف کی موجودہ خجالت پر خجالت کی ایک اور تہہ چڑھانا چاہتا تھا۔ ہم کو امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ زول سیمان جیسے محقق کی تقریر نے تمہاری اچھی طرح تشفی کر دی ہوگی۔ علامہ ''ڈوٹروشیہ'' کے لیکچر نے تمہارے دل سے تمام شکوک رفع کر دیئے ہوں گے اور عورتوں کے فرضی وکیل جو بے سروپا دلائل پیش کیا کرتے ہیں ان کی وقعت اور اہمیت سے تمہارا دانشمند دماغ خالی ہو گیا ہوگا۔ کیا امین بک کے حامی مے تن جاوزا اور فرش لوا ایک منٹ کے لیے بھی اس آفتاب فضل وکمال کے سامنے ٹھہر سکتے ہیں؟ کیا ان کی حمایت قاسم امین بک اور اس کے ہم خیال لوگوں کے لیے مفید ہوسکتی ہے؟ کون ہے جو اثبات میں جواب دے سکتا ہو اور کون ہے جو اثبات میں جواب دے کر اپنی ناواقفیت اور لاعلمی کو ثابت کر لے؟ جبکہ یورپ بھر متفقہ لفظوں میں اس کے فضل وکمال کا معترف ہے اور اسے کشورستان علم کا تاجدار تسلیم کرتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ ''پرڈن'' اور ''سموئل سمائلس'' کس پایہ کے مصنف ہیں؟ آخر الذکر کے مبارک نام سے تم ضرور واقف ہو گے کیونکہ تم تعلیم یافتہ ہو اور کوئی تعلیم یافتہ ایسا نہیں ہے جس کی الماری ''ڈیوٹی'' اور ''سلف ہلپ'' سے خالی ہو مگر اول الذکر کے فضل اور کمال سے اگر واقف ہونا چاہتے ہو تو انسائیکلوپیڈیا کی ورق گردانی کرو۔ یہ وہ شخص ہے جو سوشلزم کا مجدد اور سرخیل تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک مشہور تصنیف ''ابتکار النظام'' پولیٹکل اکانمی اور نظام تمدن کی باریکیوں کا سرچشمہ ہے۔ ہاں ہم کو پورا یقین ہے کہ یورپ کی اس منتخب اور علم ترین جماعت کی ملاقات نے تم کو فرید

وجدی کا ہم خیال اور ہم زبان بنا دیا ہوگا۔ فرید وجدی کی رائے سے تم کیوں نہ متفق ہو جبکہ تم خود گزشتہ صحبتوں میں دیکھ چکے ہو کہ مشاہیر یورپ، مؤسسین علوم اور مصنفین انسائیکلو پیڈیا ہمارے فاضل دوست کو تحسین اور اتفاق کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے سب سے آخر میں تقریر کی مختصر اور پر مغز تقریر کی۔

اچھی طرح یاد کرو بزرگ صدر مجلس اور باکمال ارکان مجلس اس کے ہر لفظ پر تحسین اور توصیف کے نعرے بلند ہوتے تھے اور مرحبا کی گونجتی ہوئی آواز دور دور تک لوگوں کو بتلا دیتی تھی کہ مقرر کی رائے سے ارکان مجلس کس درجہ متفق اور ہم آہنگ ہیں۔

گزشتہ صحبتوں کی تقریروں سے تم کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ مشرق عورتوں کے متعلق جو رائے رکھتا ہے اس کو ظالمانہ رائے کہنا ظلم اور صریح ظلم ہے۔ مشرق اگر عورتوں کو ناقصات العقل والدین کا خطاب دیتا ہے تو کیا ظلم کرتا ہے جبکہ علمائے یورپ میں ایک عالم عورت کی عقل کو طفل شیر خوار کی عقل، دوسرا انسان کے ابتدائی اور ناقص دور کی یادگار اور تیسرا ضعیف ترین بتلاتا ہے۔ تم اچھی طرح سمجھ گئے ہو گئے کہ عورتوں کی عقل اور جسمانی قوت کے متعلق علم کے دیوتا کا کیا فیصلہ ہے؟ تم اس نتیجہ پر بھی پہنچ گئے ہو گے کہ عورتوں کے فرضی وکیل جو راگ الاپ رہے ہیں علم کا دیوتا حکم صادر کرتا ہے کہ وہ نہ صرف غلط ہے بلکہ دنیا کے لیے مضر اور سینکڑوں تمدنی خرابیوں کو پیدا کرنے والی ہے۔

لیکن ابھی ایک اور اہم بحث باقی ہے۔ تم علم اور فضل کے دربار میں باریاب ہوئے مگر رعب وادب نے اس امر کا بہت کم موقع دیا کہ اپنے تمام دلی شکوک رفع کرلو۔ گزشتہ صحبت میں یورپ کے اعاظم اور کبار علماء کی تقریروں نے اس امر پر جا بجا زور دیا ہے کہ جس آزادی کے قاسم امین بک اور اس کے ہم خیال طالب ہیں وہ قوانین قدرت کے بالکل خلاف ہے۔ انسائیکلو پیڈیا کے مصنفین نے اپنی تقریروں میں اس خیال کو بھی غلط ثابت کیا ہے کہ ''فزیالوجی'' اور ''سائیکالوجی'' کی تحقیقات مرد اور عورت کو دماغی قویٰ کے لحاظ سے ایک رکھتی ہیں۔ ''آگسٹ کونٹ'' اور ''پرودن'' نے اس پر بھی زور دیا ہے کہ چونکہ عورتوں کی یہ منفرد آزادی قوانین الٰہی اور نوامیس طبعی کو توڑنے

والی ہے۔اس لیے جب کبھی اس پر عمل کیا جائے گا تمدن اور معاشرت کی بنیادیں متحرک ہو کر بتلا دیں گی کہ مفرد آزادی کا زلزلہ سوسائٹی کی عظیم الشان عمارت کو دم کے دم میں برباد کر دینے والا ہے۔ان تمام آراء کے سننے کے بعد طبیعت میں خود بخود چند شبہات پیدا ہو جاتے ہیں۔علم الاعضاء اور علم النفس والقوی کی تمام تحقیقات بے سروپا معلوم ہوتی ہیں۔''ژول سیماں''''آگسٹ کونٹ''اور''پروڈن' جیسے آسمان فضل وکمال کے آفتاب،تاریکی کے دیوتا نظر آتے ہیں اور فرید وجدی کی ہنگامہ خیز تقریر،دندان شکن جواب اور پرزور دلائل کی اہمیت آن کی آن میں حقارت اور ذلت سے مبدل ہو جاتی ہے.....کیوں......؟اس لیے کہ:

''یورپ ان تمام تحقیقات کا مبداء اور ان تمام محققین کا وطن نظر آتا ہے۔اس کا طرز عمل ان تمام تحقیقات اور آراء کا مخالف نظر آتا ہے جس قوم کے سربرآوردہ علماء خیال ظاہر کر رہے ہیں۔خود وہ قوم ان پر عامل نہیں ہے۔ہم اقوال کی پیروی کریں یا طرز عمل کی؟''

ایک مرتب اور مسلسل سلسلہ پیش نظر آ جاتا ہے۔شبہات قوی ہو جاتے ہیں اور یہ سوالات دماغ میں پیدا ہو کر فرید وجدی کی مخالفت پر زور دینے لگتے ہیں:

''کیا یہ سچ ہے کہ علمائے یورپ عورتوں کی مفرد آزادی،مساوات حقوق اور تمدنی مشاغل میں شرکت کے مخالف ہیں؟اگر یہ سچ ہے تو پھر یورپ خود ان کی اس رائے پر کیوں نہیں عامل ہوتا؟ہم کو یقین دلایا جاتا ہے کہ عورتوں کا عقلی اور جسمانی ضعف فطری ہے اور یہی قانون قدرت ہے کہ عورتوں کی دنیا مردوں کی دنیا سے بالکل الگ رہے۔ہم کو عقلائے یورپ کے اقوال سنا کر سمجھایا جاتا ہے کہ عورتوں کی مفرد آزادی اور مساوات حقوق کی کوشش تمدن اور معاشرت کو برباد کرنے کی کوشش کی ہے جب کوئی سرکش اقوام قوانین قدرت سے سرتابی کرتی ہے تو مختلف قسم کے تمدنی اور معاشرتی آلام ومصائب کا شکار ہو جاتی ہے۔پس اگر یہ سچ ہے تو کیا یورپ عورتوں کو مفرد آزادی دے کر تمدن اور معاشرت کی بنیادوں کو متزلزل کر رہا ہے؟ قوانین قدرت کی بغاوت نے یورپ کی سوسائٹی میں وہ مہلک مرض پیدا کر دیا ہے جس کی بدولت اقوام سابقہ تباہ وبرباد ہو چکی ہیں۔کیا یورپ کی خوشحالی اور آرام کی زندگی نہیں ہے؟ہم کو بتلایا جاتا ہے کہ عورتوں کا قدرتی فرض فرائض منزلی کی بجا آوری ہے مگر یورپ میں عورتیں دنیا کی تمدنی کشمکش میں برابر کی شریک ہو چکی ہیں۔ہم کیونکر ان سوالوں کا جواب اثبات میں

دے سکتے ہیں جبکہ یورپ آج تمدن کا سرچشمہ ہے جبکہ یورپ کی سوسائٹی موجودہ دنیا کی بہترین سوسائٹی ہے جبکہ یورپ آج تمام دنیا کا تمدنی معلم ہے جبکہ یورپ ہی دنیا بھر میں ایک ایسا مقام تسلیم کیا جاتا ہے جہاں کے لوگ معاشرت کا حقیقی لطف حاصل کرتے ہیں۔"

لیکن درحقیقت یہ ایک دھوکہ ہے جس میں بدقسمتی سے آج مشرق کا بڑا حصہ گرفتار ہے دور کی چیزیں ہمیں دلفریب معلوم ہوتی ہیں اس لیے یورپ کو جس عقیدت اور ارادت کی نظر سے دیکھتے ہو اس کا اقتضاء یہی ہے کہ تمہارے دماغوں میں یہ شبہات پیدا ہوں تو تم کو وہاں کی زندگی نہایت خوشنما اور وہاں کی سوسائٹی بے حد دلکش نظر آتی ہے۔ یورپ کی علمی ترقی اور تمدنی وسعت کی الیکٹرک لائٹ نے تمہاری آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے اس لیے حسن ظن تم کو اجازت نہیں دیتا کہ کسی مخالف رائے کو آسانی سے تسلیم کر لو مگر جب یورپ کے موجودہ تمدن اور سوسائٹی کی ایک مکمل تصویر تمہارے سامنے پیش کی جائے گی تو سارے عقدے حل ہو جائیں گے اور شبہات کا طلسم: هَبَاءً مَّنثُورًا ہو جائے گا۔ تم نہایت حیرت کے ساتھ دیکھو گے کہ حسن ظن کس قدر دھوکہ دینے والا ہے اور اصل حقیقت سے بے خبر رکھنے والا تھا۔ تم سخت متعجب ہو گے کہ یورپ جو علم وفن کا مرجع، معلم اور ماوا و ملجا ہے، کس طرح قوانین قدرت کی بغاوت کی پاداش میں معاشرت کے سکون اور ایمان کی نعمت سے محروم ہو گیا ہے۔ وہی یورپ جو مشرق کو نیم وحشی سمجھ کر اس کی سادگی اور جہالت پر ہنستا تھا آج مفرد آزادی کی بدولت اپنی سوسائٹی کو وحشیانہ ہلچل اور تکلیف دہ خلفشار کا سرچشمہ بنا رہا ہے اور اس کی سوسائٹی اب اس قدر آرام اور راحت بھی نہیں دے سکتی جس قدر اطمینان اور سکون امریکہ کا ایک وحشی یا افریقہ کا ایک غیر متمدن درختوں کے جھنڈ سے بنے ہوئے گھروں میں بیٹھ کر حاصل کرتا ہے۔ کیا تم یورپ کی سوسائٹی کی ایک جھلک دیکھنا چاہتے ہو؟ کیا تم اس منظر کے مشتاق ہو جو ان شبہات کے کرب اور بے چینی سے تم کو نجات دلائے؟ ہاں تمہاری متجسس نظریں اس منظر کی متلاشی ہیں؟ ہم تم کو زیادہ انتظار اور تجسس کی تکلیف نہیں دینا چاہتے۔ ورق الٹو آئندہ فصل یہ منظر پیش کر دے گی۔

❋ ❋ ❋

یورپ کی معاشرتی زندگی

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در محفل رنداں خبری نیست کہ نیست

سب سے بڑا خطرناک دھوکہ جس میں موجودہ مشرق گرفتار ہے۔ یورپ اور امریکہ کی نسبت وہ عام حسن ظن ہے جس کی بناء پر مغربی دنیا کی ہر ادا ہمارے دلوں کو لبھا لیتی ہے۔ تمدن اور علوم کی حیرت انگیز ترقی نے مغربی معاشرت کے عیوب کو چھپا لیا ہے اور مغرب کی نیکیوں نے برائیوں پر پردہ ڈال دیا ہے:

اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ.

لیکن ہماری کتاب کی یہ فصل مغربی معاشرت کی تصویر کا دوسرا رخ تمہارے سامنے پیش کر دے گی اور پہلا موقع ہوگا کہ تم اس فصل کی بدولت یورپ کو بالکل ایک نئی نگاہ سے دیکھو۔ وہی یورپ جس کی آواز تمہارے دل و دماغ میں رشک، تقلید اور تحسین کے جذبات کے تموجات پیدا کر دیتی تھی اچانک نظر آئے گا کہ وہ خلقت انسانی کا ایک بدترین اور مکروہ ترین نمونہ ہے اور یکا یک معلوم ہو جائے گا کہ وہی یورپ جو تمام دنیا کو تمدن اور علوم کا سبق دیتا ہے، ایسے سخت اور ناقابل علاج اخلاقی امراض میں مبتلا ہے جنہوں نے اس کی زندگی کو پر آلام و مصائب کا گھر بنا دیا ہے اور اس کی زندگی نمائشی اور متمولانہ شوکت کی سطح پر جس قدر بلند نظر آتی ہے اتنی ہی حقیقی آرام اور معاشرانہ راحت کے میدان میں وحشی قبائل سے بھی پیچھے رہ گئی ہے۔ اس کی متمولانہ زندگی پر ایشیاء کی پر افلاس دہقانی زندگی خندہ زن ہے اور اس کی معاشرانہ حالت پر ''ویسٹ منسٹر ایبے'' کی انجمن حکماء پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔ وہ تمدن کے انتہائی نقطہ کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس کی رفتار الف لیلیٰ کے کل گھوڑے سے بھی زیادہ تیز ہے مگر عام اخلاق کی فضا کا بالائی بوجھ اس کو نیچے کی طرف گرا رہا ہے اور تمدن کی طرف اگر ایک قدم بڑھتا ہے تو اخلاقی نقطہ سے دو قدم پیچھے رہ جاتا ہے۔

ہماری کتاب کی موجودہ فصل مغربی معاشرت کے طلسم کی کنجی ہے اور تم اس کی مدد سے اس قفل ابجد کو کھول سکتے ہو جس کو مغرب سے حسن ظن نے مغربی معاشرت کے صندوق پر لگا دیا۔

حسن ظن، معلومات کی کمی، نظر کی کوتاہی اور جدت پرستی نے مغربی سوسائٹی کی صحیح صورت پر تو پردے ڈال دیئے ہیں اور بدقسمت مشرق ایک عالمگیر غلط فہمی میں گرفتار ہے۔ ہماری کتاب کی یہ فصل ان مصنوعی پردوں کو یک لخت اٹھانے میں اگر ناکام بھی رہے تو بھی اصلی عورت کا ایک نظارہ پیش کرے گی:

لو کشف الغطا لما ازودث یقینا.

تمہاری نگاہیں بحر احمر کو طے کر کے مغربی سرزمین میں قدم رکھتی ہیں اور روشنی کی ایک جھلک دیکھ رہی ہیں۔ روشنی بہت تیز ہے اور اس میں ایک ایسی سڑک پائی جاتی ہے جس نے تمہاری آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ تمہارا حسن ظن ہے کہ یہ روشنی ایک منارۂ نور کی شعاعیں ہیں، جو مشرقی نگاہوں میں منعکس ہو رہی ہیں مگر یہ فصل خود تم کو بحر احمر کے اس پار دنیا کی سیر کرا دے گی اور تم نہایت حیرت سے دیکھو گے کہ جس روشنی کو تم منارۂ نور کی جھلک سمجھ رہے تھے وہ فاسفورس کا ایک معمولی کرشمہ تھا۔ یورپ سے مشرق کے نئے تعلقات شاگردانہ اور عاجزانہ ہیں۔ استاد کی مافوق الفطر تعظمت دلوں میں گھر کر رہی ہے اور عقیدت کا سیلاب حقائق کے جزیرے بہا لے جانا چاہتا ہے۔ غلط فہمی کا طوفان زوروں پر ہے اور وہ وقت قریب ہے جب واقعیت کا فرشتہ حسن ظن کے دیو سے سخت ہزیمت اٹھائے گا۔ اس لیے ہماری کتاب کی یہ فصل تمہاری اس غلط فہمی کو دور کرنا چاہتی ہے جس کو تمہاری نظروں کی کوتاہی اور معلومات کی کمی نے تم پر مسلط کر دیا ہے۔

ہمارے اس بیان کی بہت دلیلیں مل سکتی ہیں کہ ہر ملک اور ہر خطے میں انسانی طبیعت اصل حقیقت اور اپنی بداعمالیوں کو فریب اور نمائش کے پردوں میں پوشیدہ کرنے کے لیے سخت جدوجہد کر رہی ہے مگر اس کے ساتھ ہی نوامیس الٰہی اور قوانین قدرت کی عظیم الشان قوت بھی ذلیل اور شریر انسان کی اس بناوٹ اور ریاکاری کے پردے کو چاک کیے بغیر نہیں رہتی۔ انسان وقتی اور

مصنوعی کامیابیوں کے غرور میں تمردانہ اور گستاخ رویہ اختیار کر لیتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ میں اپنی بناوٹی کوشش میں کامیاب ہو جاؤں گا مگر احکام فطرت اس کی چال بازیوں کی قلعی کھول دیتے ہیں اور تنبیہ اور سرزنش کی زبان سے بتلا دیتے ہیں کہ انسان کی شرارت قدرت کے مقابلے میں ایک منٹ کے لیے بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ تم ہمارے اس بیان کو شک اور حیرت کی ملی ہوئی نگاہوں سے کیوں دیکھتے ہو؟ ہم صرف دعویٰ ہی نہیں کرتے اور اپنا خیال اور اپنی رائے ہی بیان نہیں کرتے بلکہ جو کچھ کہتے ہیں وہ عطر ہوتا ہے، واقعات کا خلاصہ ہوتا ہے، روزمرہ کے مسلسل اور متواتر مشاہدات کا، ہمارے بیان اور اقلیدس کی شکلیں دو متحد چیزیں ہیں جن کو دنیا مختلف ناموں سے یاد کرتی ہے۔ ہمارا بیان اور ریاضی کی بدیہیات عبارت ہیں ایک ہی مفہوم سے جن کو زمانہ غلطی سے دو چیزیں قرار دیتا ہے۔ ہمارے بیان کی صحت کا اقرار کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے زید کے اس قول کو تمردانہ گستاخی کے ساتھ عمرؓ قبول نہ کرے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔

تم دنیا اور دنیا والوں پر ایک غائر نظر ڈالو۔ تم کو معلوم ہو جائے گا کہ اس قسم کے حوادث ان مقامات میں بکثرت وقوع پذیر ہوتے ہیں جہاں اس قسم کی فریبانہ کارروائیاں افراط سے کی جاتی ہیں اور جہاں فضول ظاہرداری کا حد سے بڑھ کر عمل درآمد ہے۔ دیکھو یہ متمدن قومیں کیسے کیسے عقل کو چکر میں ڈال دینے والی تدبیروں اور مبہوت بنا دینے والے دعوؤں سے امراض روکنے کی فکر ہوتی ہیں، ادویات ایجاد کرتی ہیں اور حفظان صحت کے انتظاموں پر کروڑوں روپے سالانہ خرچ کر دیتی ہیں مگر بایں ہمہ جدوجہد جب غور سے دیکھا جائے تو جس قدر مہلک اور سخت امراض شہروں اور خاص کر زیادہ آباد متمدن مقاموں میں پھیلے ہوئے ہیں، ان کے بالمقابل وحشی اور صحرا نشین سادہ مزاج قوموں میں ان امراض کا نام و نشان بھی نہیں دیکھا جاتا حالانکہ ان بیچاروں کے پاس نہ حفظان صحت کے محکمے ہیں نہ بلند خیال، نہ تجربہ کار ڈاکٹر اور نہ بیماریوں سے بچنے کے ایسے وسائل جن کو عقلمند کی عقل تسلیم کر سکے پھر اس کی کیا وجہ ہے؟ یہی کہ وہ ابتدائی بسیط حالت اور فطری سادہ زندگی بسر کرنے میں ان متمدن انسانیت کا بڑھ چڑھ کر دعویٰ کرنے والی قوموں سے بہت کچھ بڑھے ہوئے ہیں۔ وہ براہ راست قانون فطرت کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں مگر متمدن

قومیں اپنے علم وعقل سے بہرہ ور ہونے کے گھمنڈ میں طرز زندگی کے میدان کو اپنے نفسیاتی گھوڑوں پر سوار ہو کر طے کرتی اور ظاہری وسائل استعمال کر کے احکام خالقت کی خلاف ورزی کے نقصانات سے بچنے کی کوشش میں مصروف رہتی ہیں مگر ان کی یہ روش فی الحقیقت انہیں ان قوانین قدرت کی زنجیروں میں سادہ زندگی کی نسبت کہیں زیادہ جکڑ دیتی ہے اور بجائے اس کے کہ وہ اصول فطرت کی زد سے بچ جائیں، اپنی نمائشی کارروائی کے ذریعہ سے دوسری طرح سے ان کے ہدف بنتے ہیں۔ اس بارے میں ان کی مثال سمجھانے کے واسطے صرف ان کی عورتوں کی حالت بطور نمونہ دکھانا کافی ہے۔ یورپ کے بعض خیال پرست اور وہمی انسان اس بات کے مدعی ہیں کہ ان کی عورتوں کو آزادی کا بہت بڑا حصہ نصیب ہے اور وہ بہ نسبت وحشی اقوام کی عورتوں کے اب فطرتی قوتوں سے زائد فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ یہ مدعیان باطل اپنے قول کی تائید میں بہت سے لفظی اور زبانی ثبوت بھی پیش کرتے ہیں مگر دوسری طرف فطرت الٰہی اسے جھوٹا ثابت کرتی ہے چنانچہ کبھی اس عالم کے مشہور اور سر برآوردہ لوگوں کی زبانوں سے ان کا دعویٰ غلط کر دیتی ہے اور گاہے اپنے محسوس افعال کا اثر دکھا کر کہتی ہے کہ غافل اور وہم پرست انسان مجھ سے بھاگ کر کہاں جا سکتا ہے۔ آئیے اور دیکھیے کہ آج سیاہ رنگ وحشی اور جنگلی اقوام کے مرد اور عورت میں اتنا فرق نظر نہیں آتا جتنا مہذب اور آزادی کے دلدادہ ممالک کی تعلیم یافتہ قوموں کے مرد اور عورت میں پایا جاتا ہے پھر یہ کیا بات ہے؟ یہ ایک عملی علامت ہے جو ثابت کر رہی ہے کہ متمدن دنیا کی یہ نازک جنس (عورت) استمرار کے ساتھ اپنے قدرتی مرتبہ سے نیچے گرتی چلی جا رہی ہے اور اس کا یہی ہیولا زبان حال سے چلا کر کہہ رہا ہے کہ تم عورتوں کی گرفتاری اور ماتحتی کے ظاہری پہلو کو جاہے جس قدر چمکا کر دکھاؤ یا اسے آزادی اور خود مختاری بتاؤ لیکن پھر بھی بہ نسبت وحشی قوم کے مہذب ملکوں کی عورتیں نہایت سخت مصیبت اور قید و بند میں پھنسی ہوئی ہیں۔

جناب مولف کا قول ہے کہ:

''ان عورتوں کی تعداد جو دستاویزات، عرضی دعوؤں اور ایسے ہی دوسرے کاغذوں کی تحریر کا کام کرتی ہیں یا جو گرجا کی خدمت ادا کرتی ہیں یا اخباروں، رسد خانوں اور پوسٹ آفس اور تار کے محکموں میں کام کر رہی ہیں، شمار نہیں کی جا سکتی نیز عورتوں کو زیادہ تر

سررشتہ تعلیم کے عہدے ملتے ہیں چنانچہ اس صیغہ میں تقریباً مدارس ابتدائی کی معلم عورتیں پائی جاتی ہیں۔"

فاضل مولف نے اپنے کلام کے آخر میں جملہ (یا بعض مقامات پر ایسے ہی وہ جملے بھی) محض آزادی عورت کی خوبی دکھانے کی نیت سے بڑھائے ہیں۔ علامہ ژول سیماں مولف "تحریر المراۃ ریویو آف ریویوز" کی اٹھارہویں جلد میں لکھتا ہے:

"آج کل عورتیں پارچہ بافی کی مشینوں اور چھاپہ خانوں میں کام کرنے لگی ہیں۔"

حکومت نے ان سے اپنے کارخانوں میں کام لینا شروع کر دیا ہے اور گو وہ اس ذریعہ سے کچھ ٹکے کما لیتی ہے لیکن اس کے مقابلہ میں انہوں نے اپنے گھرانوں کی بنیاد کھود ڈالی اور ان کو برباد کر دیا ہے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ مرد اپنی عورت کی کمائی سے مستفید ہو رہا ہے مگر اسی کے ساتھ وہ اس کی کاروباری زندگی سے تنگ بھی آ گیا ہے کیونکہ عورت مرد سے کام چھینتی جا رہی ہے اور اسے بیکار بنا رہی ہے پھر آگے چل کر لکھتا ہے:

"اور یہاں یورپ میں کچھ عورتیں مذکورہ عورتوں سے بھی زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ جو دفتروں کی کلرک دکانوں کی منتظمہ، سودا بیچنے والیاں، مدارس میں تعلیم کی خدمت انجام دینے پر مامور، ڈاک خانہ، تار گھر، فرانسیسی بینک اور کریڈی لیونیہ بینکوں میں ملازم ہیں مگر ان سب باتوں کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ ملازمت نے ان عورتوں کو منزلی زندگی سے بہت دور کر دیا ہے جس سے گھروں کی رونقیں مٹتی جا رہی ہیں۔"

یہ ایک ایسے شخص کا قول ہے جو صاحب خانہ ہے اور اس میں کلام نہیں ہو سکتا کہ جس قدر گھر والے کو اپنے گھر کے حالات کی خبر ہوتی ہے دوسروں کو اتنا علم کہاں ہوگا۔ اس لیے ہمیں مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے قول کا کچھ وزن خیال نہ کریں اور اس کے خلاف باتوں پر توجہ دیں۔

جناب مولف فرماتے ہیں:

"امریکن عورت کی ترقی اور اس کی عظمت شان دکھانے کے لیے صرف اتنا بیان کر دینا کافی ہوگا۔ ۱۸۸۰ء کی مردم شماری سے ظاہر ہوا تھا کہ امریکہ میں محض ان عورتوں کی تعداد جو علمی اور

زبان دانی کی خدمتیں انجام دیتی ہیں ۷۵ فیصدی وظیفہ تجارت میں کام کرنے والی عورتوں کی تعداد ۶۳ فی صدی اور دستکاری کے صیغہ میں ۶۲ فی صدی ہے۔''

مگر اسی کے ساتھ مولف ممدوح نے اس کا کوئی بھی ذکر نہیں فرمایا کہ اس ترقی نے وہاں کی معاشرت پر کیا زہریلا اثر ڈالا ہے اور سوسائٹی کے وجود میں کیسے رخنے پیدا کر دیے ہیں۔ جن کو وہاں کی صحیح مردم شماری اور محکمہ اعداد و شمار کی رپورٹوں سے واقفیت ہو وہ آدمی بخوبی جانتا ہے کہ اس متمدن ملک میں سوسائٹی کا کیا حال ہے چنانچہ ہم لگے ہاتھوں ناظرین کی توجہ اس ملاحظہ پر مائل کرنا چاہتے ہیں جو ''میڈم ڈوآ فرینوں'' نے امریکن عورتوں کی علمی اور صنعتی ترقی پر اپنے رسالہ ''انیس الجن'' مصدر ۳۰ دسمبر ۱۸۹۹ء میں درج کیا ہے۔ میڈم مذکور نے امریکن عورتوں کی کاروباری اور علمی ترقی کے اعداد و شمار دکھانے کے بعد لکھا ہے:

''مگر ان باتوں کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس قدر عورت علوم و ہنر میں زیادہ وسعت حاصل کرتی ہے اسی قدر مرد اس کو طلاق دیتا چلا جاتا ہے چنانچہ طلاق کی زیادہ صورتیں ولایات متحدہ امریکہ میں پائی جاتی ہیں۔ وہاں یہ معاملہ حیرت انگیز حد تک ترقی کر گیا ہے۔''

میڈم مذکور نے طلاق کے جس خطرہ کا ذکر کیا ہے۔ سر دست ہم اسے مناسب مقام پر بیان کرنے کے لیے اٹھا رکھتے ہیں مگر یہاں اس قدر ضرور کہیں گے کہ عورت کا علوم و ادب میں ترقی کرنا اسے مرد کی نگاہوں میں قابل نفرت بنا رہا ہے اور جو چیز اسے سب سے زیادہ بدنما اور حقیر بناتی ہے وہ اس کا خارجی عمل میں مقابلہ پر آنا ہے۔

۱۸۷۰ء میں امریکن عورتوں کی ایک شاندار کانفرنس زیر صدارت میڈم مارٹین قائم ہوئی ہے جس نے اپنے پولیٹکل حقوق کا مطالبہ کیا اور بہت سے ایسے پولیٹکل مردوں کو بھی زیر کر لیا جو قبل از تجربہ عورتوں کے سیاسی معاملات میں داخل ہونے کو مضرت رساں خیال کرتے تھے۔ اس کانفرنس کی ممبر عورتیں عام مجمعوں میں لیکچر دینے، اخبارات میں مضامین بھیجنے اور پارٹی کے رئیسوں کو پرزور دلائل سے قائل کرنے میں مصروف ہوئیں۔ یہاں تک کہ آخر کار انہوں نے مجلس

وزراء سے اس بات کا اقرار کرالیا کہ وہ انہیں پولیٹکل حقوق ادا کرے گی پھر ۱۸۷۳ء کے آتے ہی میڈم مارٹین نے اپنے آپ کچھ اور عورتوں کو امریکہ کی پریسیڈنٹی کے لیے امیدوار بنالیا اور کثرت رائے سے وہ اسسٹنٹ مقرر کر لی گئی۔ اس کا کچھ اثر صدارت پر پڑا۔ اسی دوران ان کے ساتھ والیوں میں پھوٹ پڑ گئی اور وہ سب اس سے کنارہ کشی کر گئیں۔ حکومت نے یہ صورت دیکھی تو فوراً ہی اس قانون کو ہمیشہ کے لیے منسوخ کر دیا اور ان کو معلوم ہو گیا کہ عورتوں میں باہم مل کر کام کرنے کی صلاحیت بالکل نہیں ہے۔ ولایت متحدہ امریکہ کی تاریخ کا یہ ایک مشہور واقعہ ہے اور ''ریویو آف ریویوز'' کی اٹھارہویں جلد میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔

علامہ پرودڈن جب عورتوں کو ایسی ناواجب آزادی دلانے والوں کی بک بک سے تنگ آ گیا تو اس نے لکھا:

> ''اور علاوہ اس کے کہ میں اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا جن کا نام آج کل لوگوں نے عورت کو آزادی دلانا رکھ چھوڑا ہے۔ میری یہ خواہش بھی ہے کہ اگر ضروری حالت کا اقتضا ہو تو زمانہ سابقہ کی فرح میں عورت کو قید کرنے کا حکم دے دوں۔'' (ملاحظہ ہو ابتکار النظام)

کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ زمانہ کی جنبش عورتوں کو جس خودمختاری کا طالب بنا رہی ہے اس کا منشا یہ نہیں کہ کنبوں کی بنیاد منہدم کر دے یا وہی ابتدائی زمانہ کی حالت کر دے اس سے عورت ہرگز ذلیل متصود نہ ہو گی۔ اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ جس نے تاریخ کو خود پلٹ کر آنے والی کہا ہے وہ بالکل سچ کہتا ہے کہ اس وقت دنیا کے متمدن ملکوں میں عورتیں شادی کرنے سے باز رہتی ہیں۔ ان کے خیال میں یہ رسم مٹا دینے کے قابل ہے اور اس بارے میں ان کی ضخیم تصنیفات شائع ہو رہی ہیں۔ ریویو آف ریویوز کی جلد ۸ میں آیا ہے کہ:

> ''شادی بیاہ جس کو ہمارے باپ دادا ضروری تصور کرتے تھے آج دکھا دیا گیا ہے کہ اسے ہر مقام پر صدمہ پہنچ رہا ہے کیونکہ عورت نے جو عقلی ترقی حاصل کر لی ہے اور جس طرح اس کے حقوق روز بروز بڑھتے جاتے ہیں اور جس کے ساتھ ہی عورت کو مرد کے برابر حقوق

حاصل کرنے اور اس کی درازیوں کو روکنے کی جیسی شدید خواہش پیدا ہوگئی ہے، یہ سب باتیں ہمارے ان خیالات کو صدمہ پہنچا رہی ہیں جن کو ہم وراثت کے طور پر شادی کے معاملہ میں رکھتے ہیں۔''

پھر کسی قدر آگے چل کر کہتا ہے:

''مردوں کا شادی سے انکار کرنا اور طلاق کو پسند کرتے جانا، یہ دونوں اگر روز بروز امریکہ اور تمام متمدن یورپین ملکوں میں بکثرت پھیل رہے ہیں۔ اس لیے دونوں کی یہ تمام سرکشی اور ہڑبونگ ایک متعدی بیماریوں کی طرح معلوم ہوتی ہے جس پر آئین وقوانین وضع کرنے والے اصحاب کا نوٹس لینا ضروری ہے۔''

افراد یا قوموں میں عورتوں کی اسیری کا بدنما منظر یہ ہوتا ہے کہ اس کے بسر اوقات کا بار اسی کی گردن پر ڈال دیا جائے اور اس کے نازک جسم اور نرم محبت بھرے دل کو زندگی کے میدان میں مردوں کے مقابلہ پر آنے اور ان کے دوش بدوش اور کسب معاش کی سعی پر مجبور کیا جائے۔ اگر بدقسمتی سے تم کو کسی دن یورپ اور امریکہ کے ان عظیم الشان کارخانوں کی سیر کرنے کا موقع ملے جن کی وسعت وعظمت اور عمارت کو دیکھ کر عقل حیران ہو جاتی ہے تو سب سے پہلے جو چیز تمہارے پیش نگاہ ہوگی، وہ اس نازک ولطیف جنس عورت کی ایک بہت بڑی جماعت ہوگی جو سخت سے سخت جسمانی طاقتوں اور جفاکشی کے کاموں میں مصروف نظر آئے گی۔ کچھ عورتیں بھرے ہوئے انجن کے چولہوں کے سامنے ان میں کوئلہ جھونک رہی ہوں گی، جن کے دل فریب چہرے آگ کی گرمی اور کوئلہ اور دھوئیں کے رنگ جم جانے سے سیاہ پڑے ہوں گے اور ایسی ناگوار اور تلخ زندگی کی آفتوں نے ان کی پیشانیوں پر یہ جملہ لکھ دیا ہوگا جس کا مضمون تمہارے خیال سے ابدالاباد تک بھی محو نہ ہوگا کہ مرد عورت کو جس طرح گرفتار بلا کر سکتا ہے یہ اس کی انتہائی حد ہے پھر اگر تم ان آفتوں کی ماری عورتوں سے یہ بات دریافت کرنے کی تکلیف کو گوارا کرو گے کہ آخر دن بھر میں اس دنیاوی جہنم میں کام کرنے سے ان کو اجرت کیا ملتی ہے تو سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں متفق اللفظ ہو کر یہی کہیں گی کہ روزانہ اجرت فی نفر بیس سینٹم۔۲ سے زائد نہیں جو اتنی جفاکشی اور ایڑی چوٹی کا

پسینہ ایک کر دینے کے بعد انہیں نصیب ہوتی ہے پھر یہی اجرت ان متمدن ممالک میں ایک وقت پیٹ بھر کر کھانے کے واسطے بھی پوری نہیں پڑتی اور ان مزدور عورتوں کی حالت دیکھنے کے بعد اگر کہیں یہ دیکھنا مقصود ہو کہ وہاں زنانہ ڈاکٹر اور انجینئر عورتیں کس قدر ہیں تو ان کی تعداد پانچ فی صدی نظر آئے گی اور یہ تعداد ان ممالک میں ہوگی جو مدنیت اور علم کے اعتبار سے آج ممالک دنیا میں سرتاج مانے جاتے ہیں۔

علم الانسان کا استاد "جیوم فریرو" ریویو آف ریویوز کی پہلی جلد میں جو ۱۸۹۵ء میں شائع ہوئی تھی، لکھتا ہے:

> "جس مدنیت کی شکل میں ہم اس وقت زندگی بسر کر رہے ہیں اس کی انتہائی پیچیدگیوں کے جلد حل ہونے کا خوف دلانے والی علامتیں یوں بہت زیادہ نظر آتی ہیں کہ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جس میں کوئی نہ کوئی بحث اور تجسس کرنے والا شخص ان چند نئی نئی خطرناک باتوں سے واقفیت حاصل نہ کرتا ہو۔ اس لیے ہم کو بھی ایک طبیب کا فرض ادا کرنے اور اسی تشخیص کی مساعدت کرنے کی ضرورت ہے جو اس نئے زمانے کے اطباء نے اس نئے شوشل (معاشی) مرض کے لیے تجویز کی ہے کیونکہ رہبانیت کی یہ نئی شکل اور کسی دین وملت کی سند پر قائم نہیں ہوئی ہے تاہم ہمیں اس بات کی دھمکی ضرور دے رہی ہے کہ عنقریب وہ اس درجہ تک پہنچ جائے گی جس درجہ تک قرون وسطیٰ کے زمانوں میں دینی رہبانیت پہنچ گئی تھی۔"

یہ بات ملکوں کے مردوں اور عورتوں کے تجربہ میں آ گئی ہے کہ شادی بیاہ کے بارے میں جو دشواریاں اور رکاوٹیں حائل ہو رہی ہیں، ان کا شمار روز بروز بڑھ رہا ہے اور بہت سے لاتعداد اقتصادی اسباب بھی اس کے راستے میں رکاوٹ بن کر آ کھڑے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اکثر مرد اپنے آپ میں انہیں دور کرنے یا مغلوب ہونے کی قوت نہ پا کر مجبوراً مجرد رہنے پر صبر کر لیتے ہیں اس لیے ہمیں یہ کہنے کی گنجائش ملتی ہے کہ عورت و مرد دونوں جنسوں کی ایک عظیم الشان تعداد کا بغیر شادی بیاہ کے زندگی بسر کرنے سے موجودہ طرز معاشرت کی حالت پر سخت ہولناک اثر ڈالنا لازم آتا ہے یعنی زندگی کی کاروباری شرطوں میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے اور اسی سے یہ بھی نتیجہ

نکلتا ہے کہ بن بیاہی اور کنواری رہنے والی عورتوں کی بہ نسبت بیاہے مردوں کے بڑے اور اہم آثار ظاہر ہونے لازم ہیں کیونکہ مجرد مرد کا مجرد رہنا اس میں فی الواقع چند ایسی نفسیاتی حرکتیں بہت زیادہ بکر دیتا ہے جو اس کے لیے مخصوص ہیں تاہم یہ حالت اس کی شخصی مصیبت اور بناوٹ کو بالکل بدل نہیں دیتی۔ اس لیے مجرد رہنا مرد پر مطلقاً پاک دامنی کو واجب الادا نہیں بناتا بلکہ بصورت مجبوری وہ بدچلن عورتوں سے خلط ملط پیدا کر لیتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ تجرد کے اس فزیالوجیکل وظیفہ کو بالکل مٹا نہیں سکتا مگر عورت کی حالت اس کے برعکس ہے کیونکہ موجودہ سوسائٹی کی شرطیں بن بیاہی رہنے کی حالت میں بھی اس کی پاک دامنی کی متقاضی ہیں اور یہ پاک دامنی چاہتی ہے کہ عورت کے ماں بننے کا وظیفہ سرے سے حذف کر دیا جائے جس کے لیے روحانی طور پر عورت پیدا کی گئی ہے اور اس میں شک نہیں کہ عورت کی یہ حالت اس کی شخصیت کو بہت جلد خراب کر دے گی اور بلاشبہ ایسی عورتوں کی ایک بڑی تعداد سوسائٹی کی ہیئت پر نہایت ہولناک اثر ڈالے گی۔

اس مشہور عالم علم تمدن کا یہ قول اور ایسے ہی بہت سے اقوال ہمارے پیش نظر ہیں۔ جن سے ہمیں صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ موجودہ یورپین مدنیت کی شکل میں بہت سی ایسی خوفناک علامتیں دکھائی دیتی ہیں جو اس بات کا پتہ دے رہی ہیں کہ اس کے ڈھانچے کی پیچیدگیاں بہت جلد حل ہونے والی ہیں اور خاص عورتوں کی طرف سے اس نے جو بظاہر فریب دینے والا ڈھچر بنا رکھا ہے اس کا عقدہ سب سے پہلے چلے گا۔ اس لیے اگر ہمیں کسی امر میں یورپ کی تقلید کرنا ایسا ہی ضروری ہے جس سے مفر نہیں تو کم از کم ہمیں پہلے اس طریقہ کو جانچ لینا چاہیے اور عقل و حکمت کے معیار پر اس کا کھوٹا کھرا پرکھ کر اس پر عمل کرنا چاہیے تاکہ غلطی کھانے سے پہلے اور مصیبت میں مبتلا ہونے سے قبل ہی علیٰ وجہ البصیرت کام کر سکیں ورنہ بعد میں پچھتانے سے کیا حاصل ہوگا۔ اگر ہمیں خود اتنی عقل نہیں کہ تمدن کے ان بڑے بڑے مسائل کو دور اندیشی کے معیار پر آزما سکیں جن کو قوموں کے مستقبل سے ارتباط ہوتا ہے تو آسان بات یہ ہے کہ اسی مدنیت کے نامور علماء کو اپنا رہنما بنائیں اور ان کے روزمرہ کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔

عورتوں کوآزادی دلانے کا سب سے بڑا حامی اور پر جوش ممبر فیلسوف نور یہ لکھتا ہے:

''آج عورت کی حالت کیا ہے وہ ہر طرح محرومی اور مصیبت کی دنیا میں زندگی بسر کرتی ہے، یہاں تک کہ دستکاری کے کام میں بھی اسے پوری گنجائش اپنے کسب معاش کی نہیں ملتی کیونکہ مردنے اس میدان کے بھی ہر ایک گوشہ پر قبضہ کرلیا ہے یہاں تک کہ سلائی اور کشیدہ کاڑھنے کی صنعت جو محض عورتوں کو زیبا تھی وہ بھی مرد کے قابو میں ہے اور عورت کو دیکھیے کہ چپقلش کی زندگی میں مبتلا ہو کر سخت سے سخت محنت کے کاموں میں مصروف ہوتی ہے جو اس کی قوت سے باہر ہیں۔ پھر اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ بھی نہ ہو تو پھر آخر مال ودولت سے محروم عورتوں کے زندگی بسر کرنے کے مصادر اور کیا ہیں؟ آیا محض تکلا یا اگر وہ حسین ہوں تو ان کا حسن و جمال؟ بے شک غریب عورتوں کے بسر اوقات کا ذریعہ کھلے بندوں یا چھپے ڈھکے صرف ہم بستری کے کام آنا ہے اور یہی ایک ایسی تدبیر ہے جس کے بارے میں اہل علم آج تک عورتوں سے جھگڑ کر سر بسر ہوتے ہیں۔ اس بدقسمتی نے عورتوں کو اس طرح کے تمدن اور شوہر کی غلامی میں گرفتار کیا ہے جس سے نجات پانے اور مقابلہ کرنے کے بارے میں وہ اب تک کچھ بھی غور نہ کرسکیں اور آیا عورتوں کی اس قسمت میں ہم کو کچھ بھی انصاف کا شائبہ نظر آسکتا ہے۔''

اب کوئی بتائیے کہ بیچاری عورت اتنی سخت مزاحمتوں کی جھرمٹ سے کیونکر نکل سکے اور نکل کر کہاں جائے؟ اور کہا جاتا ہے کہ جس طرح انسان کی مادی حالت ہر زمانہ میں ترقی کرتی رہتی ہے اسی انداز سے اس کی اخلاقی کیفیت اور نرم دلی بھی بڑھتی رہتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ بیسویں صدی میں اس نازک جنس (عورت) کی قابل رحم حالت پر اشک حسرت نہ بہائے جائیں اور کیوں اس پر ترس نہ کھایا جائے؟ کیا کوئی رحم دل آدمی یا جس کو ذرا بھی مہربانی کا احساس ہو اس بات کو قبول کرسکتا ہے کہ جسمانی اور روحانی حیثیت سے جس وظیفہ طبعی کے ادا کرنے کو پیدا کی گئی ہے اسے چھوڑ کر اس کسب معاش کی خونی جنگ میں شریک ہو نہ کہ یہ صرف مرد کا حصہ ہونا چاہیے لیکن عورت ان مزاحمتوں کی کشمکش سے نکل کر کہاں جائے جو محض مادی حالتوں کی حد تک ہی پہنچ کر نہیں رکتیں بلکہ باطنی حالتوں تک بھی تجاوز کر جاتی ہیں۔ مشہور توں ری فیلسوف پرودن اپنی کتاب ''ابتکار النظام'' میں لکھتا ہے:

''نوع انسانی کسی اخلاقی، سیاسی اور علمی فکر میں عورت کی ہرگز زیر بار احسان نہیں۔ وہ علم کی سڑک پر بغیر عورت کی مساعدت کی چلی ہے اور اس نے خود ہی حیرت انگیز عجائبات ظاہر کیے ہیں۔''

علامہ پرودُن لکھتے ہیں:

''اخلاقی دنیا میں عورت نے مرد کے ساتھ جو بازی کھیلی تھی وہ بجنسہ اس بازی کی طرح تھی جیسی آج دخانی طاقت سے چلنے والے کارخانوں میں کھیلنا چاہتی ہے اس لیے نہ اسے پہلے معتد بہ نفع حاصل ہوا اور نہ اب کوئی فائدہ ہونے کی توقع ہے اور کارخانوں میں مرد کے بالمقابل عورت کی ہستی صرف بعض چھوٹے چھوٹے آلات کی طرح پائی جاتی ہے۔''

نامور علامہ ژول سیماں نے ریویو آف ریویوز میں فرانس کے علامہ لوز ودیہ کی کتاب پر ریویو کرتے ہوئے لکھا ہے:

''عورت کو عورت رہنا چاہیے۔'' یہ سیلویز زودیہ کا فقرہ ہے۔ بے شک عورت کو عورت رہنا چاہیے کیونکہ وہ اسی صفت کے ذریعہ سے اپنی سعادت کو پاسکتی ہے اور اسے اپنے سوا دوسرے شخص کو بھی بخش سکتی ہے، اس لیے عورتوں کی حالت سنوارنی چاہیے نہ کہ اسے بالکل ہی بدل دیں اور ہمیں مناسب ہے کہ عورتوں کو مرد بنا دینے سے پرہیز کریں کیونکہ اس کی وجہ سے وہ بہت بڑی خوبی اور بہتری کو ہاتھ سے کھو بیٹھیں گی اور ہم بھی تمام باتوں کو گنوا دیں گے بلاشبہ فطرت نے اپنی تمام مصنوعات کو کامل اور اکمال بنایا ہے ہمیں ان کی حالت پر غائر نظر ڈالنے اور صرف ان کے عمدہ بنانے کی ضرورت ہے جس کے ساتھ ہی جو امور ہم کو قوانین قدرت سے دور ڈالنے والے یا اس کی مثل ہوں، ان سے بچنے کی بھی حاجت ہے۔ بعض فلاسفر کہتے ہیں کہ زندگی مصائب میں مبتلا ہونے کا نام ہے مگر شاید ان کے قول کا موجب یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تمام زندگی میں کبھی محنت کا ذائقہ نہیں چکھا لیکن میں کہتا ہوں یہ بے شک زندگی کے بڑے لطف اور خوبی کی چیز ہے مگر اس شرط سے کہ عورت و مرد میں ہر ایک اس محل اور موقع کو اچھی طرح جان جائے جسے خداوند پاک نے ان میں سے ہر ایک کے واسطے خاص بنایا ہے۔''

۱۸۹۵ء کے رسالہ ریویو آف ریویوز میں علامہ جیورم فریر لکھتا ہے کہ:

''یورپ میں بہت سی ایسی عورتیں پائی جاتی ہیں جو ہر طرح مردوں کے ایسے کام کرنے سے شادی بیاہ کا معاملہ بالکل چھوڑے بیٹھی ہیں۔ ان عورتوں کو عورت و مرد کے سوا ایک تیسری جنس کا

نمونہ کہنا چاہیے کیونکہ وہ مرد سے ترکیب جسمانی اور طبیعت میں یکساں نہ ہونے کے باعث مرد نہیں کہی جاسکتی اور عورت کے طبعی فرائض ادا نہ کرنے عورت بھی نہیں رہی۔''

اس نامور استاد نے ایسی عورتوں کی حالت پر غائر نظر ڈال کر معلوم کیا ہے کہ ان کی بناوٹی زندگی بسر کرنے کی روش اور ان کے اپنے اس طبعی وظیفہ کے ادا کرنے سے باز آ جانا جس کے لیے وہ جسمانی اور روحانی اعتبار سے پیدا کی گئی تھیں۔ ان کے احساسات کو دوسری عورتوں کے احساسات کی نسبت متغیر کر چکا ہے اور ان کی حالت مالیخولیا کے مرض میں مبتلا ہونے والے مریضوں کی سی ہوگئی ہے۔ گویا انسانی فطرت اپنی تاثیر کی زبان حال سے ان پر حجت قائم کرتی ہے کہ اگر تم نے میرے حقوق سے چشم پوشی کی تو میں نے بھی تم کو اس کی کافی سزا دی ہے پھر پروفیسر ممدوح یوں لکھتا ہے کہ:

''علم تمدن اور عمران کے علماء نے اس منافی قانون فطرت امر کے انجام بد کو محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کیونکہ یہ عورتیں مردوں کی مزاحمت کرنے کی وجہ سے سوسائٹی پر ایک بارگراں نظر آتی ہیں۔ ان کو ایسا کوئی کام نہیں ملتا جسے کر کے زندگی بسر کر سکیں اور اگر اسی طریقہ پر کچھ عرصہ تک یہ حالت قائم رہی تو اس سے تمدن اور معاشرت میں عظیم الشان خلل پیدا ہونا یقینی ہے۔''

کیا ان سب باتوں کو معلوم کر لینے کے بعد بھی ہمیں یہ مناسب ہے کہ عورتوں کو اپنے تئیں اس خارجی زندگی کے میدان کارزار میں شامل کرنے کی صلاح دیں۔ کیا جب ہم پر یہ ثابت ہو گیا کہ یہ معاملہ ایک معاشرت کی کمر توڑنے والی بیماری ہے تو اس کے بعد بھی ہم کو اس کے پھیلانے اور بڑھانے کی کوشش کرنا لازم ہے۔ اہل یورپ کے یہاں ہزاروں کارخانے اور صدہا پیشے دولت کمانے کے موجود ہیں مگر بایں ہمہ وہ یہی کوشش کر رہے ہیں کہ مزدوری کا میدان صرف مردوں کے ہاتھ ہی میں رہے اور عورتوں کو اس میں قدم رکھنے سے روکا جائے تو پھر کس قدر افسوس کی جگہ ہے کہ ہم باوجود اپنے عملی ذرائع کی کمی کے اس وقت کو بڑھانے کی سعی کریں، کیا ان اختیارات کے بعد بھی ہمیں مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ شریعت اسلامی کے مکمل نظام کو

بدلنے کی لایعنی کوشش سے باز آئیں۔ جو نظام فطرت انسانی کا ترجمہ اور قوانین فطرت کی زبان حال ہے اور کیا اس بات کو دیکھ کر یورپ کی ایک جان فرسا بیماری ہم کو اس پاکیزہ شریعت کے احکام سے دور اور اس کی ممانعتوں سے نزدیک بنانے والی ہے۔ ہمیں مناسب نہیں کہ حکمت کی راہ سے ایسی مہلک بیماری کے پیدا ہونے والے اسباب پر غور کریں اور ان سے بچتے رہیں، چہ جائیکہ الٹا اسی میں مبتلا ہونے کو پسند کریں۔

❋ ❋ ❋

قدرتی طور پر عورت بیرونی کاموں میں دخل دے سکتی ہے؟

خداوند کریم نے مخلوقات کو نہایت مکمل نظام اور عمدہ اصول پر خلق فرمایا ہر ایک مخلوق کو اس کی ضرورت کی تمام چیزیں عطا کیں۔ جیسے اعضا اس کے واسطے ہونے چاہئیں ویسے ہی اعضاء عنایت کیے، ہر ایک عضو میں ان کے حسب حال اور بقدر ضرورت اپنی خواہشیں پوری کر سکنے کی قابلیت ودیعت فرمائی۔ مثال کے طور پر بے زبان جانوروں کے دانتوں ہی کے متعلق غور کرو۔ تم کو معلوم ہو جائے گا ان کے باہمی شکل اور ترتیب میں بہت بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ گھاس پھوس کھانے والے جانوروں کے دانت سادے اور تیز اور صرف نباتات چبانے کے لائق ہیں۔ گوشت خور حیوانوں کے دانت نوکدار اور ان کی داڑیں مضبوط اور تیز بنائیں ہیں تاکہ وہ اپنی غذا کو اچھی طرح نوچ کر چبا سکیں۔ غرض یہ کہ اسی طرح مخلوق کے اجزاء اور اعضاء میں ایک خاص ترتیب اور مناسب استعداد موجود ہے جو اس کے روزمرہ ضروریات زندگی میں کارآمد ہو سکتی ہے۔ تاریخ طبعی کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہی مشاہدہ اس بات پر دلیل قائم کرنے کا موزوں ذریعہ ہے کہ عورتوں کا مردوں کے کاروبار میں مصروف ہونا، ان کے خلاف فطرت کام کرنے کے ہم معنی اور اپنے دائرہ طبعی سے نکل جانے کے مترادف ہے پھر اگر اس کی خلاف ورزی پر ان کو مجبور بھی کیا جائے تو یہ بات اس امر کا واضح نشان ہوگی کہ سنگ دل اور بے رحم مرد نے اپنے کمزور اور نرم دل ساتھی کو کس طرح آفتوں میں مبتلا کیا ہے اور اسے اس خارجی زندگی کے خطرناک میدان میں بھی بے رحمی کے ساتھ کر بسپار ہا ہے۔

عورت کی خلقت اور اس کے سراپا کی بناوٹ اس بات پر صاف دلالت کرتی ہے کہ اسے مرد کی دنیا کے علاوہ ایک اور عالم میں زندگی بسر کرنا واجب ہے ورنہ اس کی وہی مثال ہوگی جیسا کہ پروفیسر جیورم فریئر لکھتا ہے:

''یعنی وہ مرد اور عورت کے مابین ایک تیسری جنس کا نمونہ بن جائے گی۔'' جس کی امتیازی علامتیں ترش روئی، غمگینی، دائمی پریشانی اور مالیخولیا ہوں گی۔

عورت کے احساسات پر نظر ڈالنے سے وہ مجسم رحمت و شفقت اور محبت کا نمونہ نظر آئے گی پھر عورت کے طبعی میلان کو دیکھا جائے تو وہ ایثار نفس پر آمادہ، دوسروں کی فائدہ رسانی میں کوشاں، فطرتاً نیکی اور احسان کرنے کی جانب راغب پائی جائے گی، یہ سب صفتیں خارجی دنیا کی مصیبتوں کے بالکل منافی ہیں کیونکہ خارجی زندگی باہمی کشمکش اور ایک دوسرے پر تعدی، رکاوٹ اور دھینگامشتی کے لیے تیار رہنے سے بسر ہوتی ہے۔ اس زندگی کا تمام تر دارومدار سنگ دلی پر ہے۔ اس لیے نرم دل اور رحیم المزاج عورت اس جہنمی لڑائی میں کیوں کر شریک ہو سکتی ہے؟ اس کا رقیق دل ان آفت خیز سنگدلی کے آثار کو کس طرح دیکھ سکتا ہے جن کے مشاہدہ سے بڑے بڑے بہادروں کا زہرہ آب ہو جائے، یہی سبب ہے جن ملکوں میں عورت کو مردوں کے ساتھ کاروبار میں شریک ہونے کی عام اجازت ہے، وہاں عورت کی حالت نہایت قابل رحم اور اس کی بسر اوقات کا دائرہ بے حد تنگ ہے۔ چنانچہ خود فلاسفر ''فوریہ'' جو عورت کا بہت بڑا حامی ہے، اس کے متعلق یوں لکھتا ہے:

''عورتیں کاروباری دنیا میں پھنس کر محنت کا ناقابل برداشت بوجھ اٹھاتی اور فاقہ و تنگدستی میں ایام گزارتی رہتی ہیں۔''

یا جس طرح ''علامہ پرودن'' ان کو'' کارخانوں میں بعض چھوٹے اور کم استعمال میں آنے والے آلات سے مشابہ بیان کرتا ہے۔'' ۱۸۹۷ء کے ریویو آف ریویوز میں اسی فلاسفر کا یہ قول بھی درج کیا گیا ہے کہ بہت سی عورتیں نہایت محنت کے ساتھ کام میں مصروف رہنے کے بعد بھی صرف ۲۰ سینٹ مزدوری حاصل کرتی ہیں جو ان کے ایک وقت کے ادنیٰ درجے کے کھانے کو بھی پوری طرح کافی نہیں ہوتی۔ یہ سب باتیں کیوں ہیں؟ اس لیے کہ عورت کسی طرح اور کبھی مرد کا مقابلہ نہیں کر سکتی جہاں اس نے کسی مفید کام میں ہاتھ ڈالا، معاً مرد بھی اس میدان میں جا اترا اور عورت کو دھکے دے کر پیچھے ڈالتا ہوا اس سے آگے بڑھ گیا۔ چونکہ مرد میں جسمانی قوت کے ساتھ جرات

اور محنت برداشت کرنے کی بھی طاقت ہے اس لیے وہ ہر ایک کام میں عورت پر یقینی فوقیت حاصل کر لیتا ہے حتیٰ کہ سلائی اور کنگھی چوٹی کے کاموں میں بھی مرد نے عورت کی روزی چھین لی ہے۔

آزادی نسواں کے حامی کہا کرتے ہیں کہ پھر یہ لیڈی ڈاکٹر اور انجینئر عورتیں یا بڑی بڑی ذی علم معلمہ اور اہل قلم عورتیں جن کے تذکرے روزمرہ پڑھے جاتے ہیں، کیا یہ عورتیں نہیں؟ مگر ہمارے پاس اس بات کا معقول جواب یہ ہے کہ اول تو کم ہیں اور جو ہیں ان پر مالدار ماں باپ نے انہیں کے برابر تول کر سونا خرچ کیا جب کہیں ان کو یہ مرتبہ حاصل ہو سکا مگر اسی کے بالمقابل مفلس اور بھوکوں مرنے والی عورتوں کی تعداد پر نظر ڈالی جائے تو وہ لاکھوں سے بڑھ کر کروڑوں تک شمار کی جا سکیں گی اور پھر اسی کے ساتھ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ آیا وہ زنانہ ڈاکٹر یا انجینئر عورتیں اصول فطرت اور قوانین قدرت کے سامنے بھی سر تسلیم خم کرتی ہیں یا نہیں اغالباً اس کا جواب زیادہ ترنفی میں ملے گا۔ وقت ہم دریافت کریں گے کہ کیوں صاحب کیا ان عورتوں کو مناسب نہ تھا کہ وہ بجائے خود ڈاکٹر یا انجینئر بننے کے اگر چند عالی حوصلہ اور روشن خیال مرد ڈاکٹروں اور انجینئروں کی مائیں بنتیں تو یہ صورت نوع انسانی کے حق میں زیادہ مفید ہوتی یا ان کی موجودہ حالت زیادہ نفع رساں ہے؟ افسوس جن نیک دل بیویوں کا قدرتی فرض انسانی نسل کی افزائش اور قوم کی فلاح دینے والے اصولوں پر بچوں کی تربیت کرنا مان لیا گیا ہے، وہ ماں کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتی جائیں یہ کیا غضب ہے، بے شک ایسی صورتیں قوانین فطرت سے سرکشی کرنے میں شمار ہوں گی اور ان کو نوع انسانی کے کمال اور اس کی ترقی کا موجب قرار دینا سخت غلطی ہوگی۔ فاضل مؤلف فرماتے ہیں:

> ”مگر اس کا یہ بیان ہے کہ نظام عالم کے اقتضاء سے بہت سی عورتوں کو تنہا بے یار و مددگار زندگی بسر کرنے کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کو اس بات کی ضرورت پیش آتی ہے کہ اپنی بسر اوقات اور بچوں کی پرورش کے لیے کچھ محنت مزدوری کر کے چار پیسے پیدا کریں۔“

ہم کہتے ہیں کہ ہمیں ایسی عورتوں کی حالت زار پر توجہ کر کے دیکھنا چاہیے کہ ان کو تنگدستی اور پریشاں روزگاری میں مبتلا ہو کر قوانین فطرت کی خلاف ورزی کرنے سے محفوظ رکھنے کی کیا تدبیر کی جا سکتی ہے۔ پھر مناسب طریقوں سے ان کی گزر بسر کا سامان کر دینا چاہیے جو انسانی ہمدردی کا

مقتضی ہے نہ یہ کہ الٹا انہیں بلا ہی میں پھنسانے کا سامان کریں اور اس کو تمدن کی خوشنما صورت قرار دے کر یہ مرض اور زیادہ بڑھائیں۔

خدارا! ذرا دیر کے لیے ان عورتوں کی حالت پر غور اور مہربانی کی ایک نظر ڈالو جنہیں بیاہ شادی سے نفرت اور نقلی مرد بننے کا شوق اس بات پر مجبور کر رہا ہے کہ وہ دوپہر کو چلچلاتی ہوئی دھوپ میں اور تپتی ہوئی ریت پر اپنا پیٹ پالنے کے لیے سخت سے سخت کام کریں اور پھر بھی اپنی جان کو موت کے چنگل سے بچانے کے واسطے صرف اتنی ہی اجرت کما سکیں جو ان کو تنگی ترشی سے وقت گزاری کا فائدہ دے۔ کون سا دل ایسا ہوگا جو مستورات کی نازک جنس کو ایسی رنج دہ حالت میں دیکھنا پسند کرے اور اسے بیسویں صدی کے ذریں تمدن کا نظر فریب پہلو بتائیے۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ عورت کی ہر ایک چیز اور حیثیت اس بات کو بتاتی ہے کہ وہ مردوں کے کاروبار سے الگ تھلگ رہنے اور کسی دوسرے جنسی وظیفہ کو ادا کرنے کے واسطے پیدا کی گئی ہے۔ دیکھو جس وقت عورت حاملہ ہوتی ہے تو وہ ایسے دور میں ہوتی ہے جبکہ اس پر اپنی ذات کی خبر گیری بہت ہوشیاری سے کرنی واجب ہے۔ ان دنوں وہ مختلف منظروں اور خاص کر خوف یا رنج دلانے والے منظروں کو دیکھ کر نہایت جلد متاثر ہو جایا کرتی ہے اور طباء نے اس بارے میں ضخیم ضخیم کتابیں تصنیف کی ہیں۔ پھر وہ دور ولادت میں منتقل ہوتے ہی واقعی بیمار پڑ جاتی ہے جس میں مختلف شکلوں کے بخاروں کا نشانہ بنتی ہے اور جیسی استعداد یا جیسا مزاج ہوتا ہے اسی کے کم و بیش تکلیف برداشت کرتی ہے۔ پھر وہ بچے کو دودھ پلاتی ہے اور یہ ایسا زمانہ ہوتا ہے کہ اس میں بچہ کی جان اور اس نازک وجود کی زندگی کا دارومدار ماں کے دودھ کی خوبی اور خرابی پر رہتا ہے تو اب بتائیے کہ ایک سیاسی عورت جو پارلیمنٹ کی ممبر ہے، حاملہ ہونے کی حالت میں شریک جلسہ ہوگی اور جیسا کہ اکثر پارلیمنٹ کے ممبر کسی مباحثہ کے مجادلہ کی صورت اختیار کر لینے پر آپس میں جوتی پیزار، لات گھونسے چلانے لگتے ہیں، وہی کیفیت اسے درپیش آ گئی تو اس بیچاری عورت پر کیا گزرے گی؟ یا وہ کسی قانون کی تنسیخ اور کسی دفعہ قانون کی ترمیم و تغیر پر بحث کرنے کو کھڑی ہوئی تو کوئی خوش بیان مقرر اس کے معارضہ کو اٹھا جس نے سینکڑوں قوی دلائل سے اس عورت کو ساکت

بنادیا تو بتائیے کہ اس انفعال اور شرمندگی سے اس پر کیا حالت طاری ہوگی؟ جس سے اگر وہ حاملہ ہے تو اس کے حمل میں اور دودھ پلاتی ہے تو اس کے دودھ میں فساد پیدا کرنے کا سخت اندیشہ ہوگا۔ افسوس ہے کہ خدا نے عورت کو سکون و آرام کی زندگی بسر کرنے کے واسطے بنایا مگر ہم ناموس الٰہی اور قوانین فطرت پر تعدی کر کے اسے جنگ وجدل اور کشمکش زندگی کے میدان میں کھینچ لانے کی کوشش کریں اور:

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ (٦٥:١)

کے فرمان کو اپنے حسب حال بنالیں تو آخر کیوں؟

اچھا ہم تھوڑی دیر کے لیے یہ بھی مان لیتے ہیں کہ ساری دنیا نے ایک ساتھ عورت کو مردوں کے کام سنبھالنے کا مستحق قرار دینے میں نظام عالم کے تغیر کی کوئی پروا نہیں کی اور اسے بالکل اس بات کا مجاز بنادیا کہ وہ تمام مردوں کے کاروبار اپنی گردن پر اٹھائے تو کیا دین فطری (اسلام) کے پابندوں کے لیے بھی یہ بات مناسب ہے کہ وہ اس درجہ تک احکام فطرت کا معارضہ کرنے میں غیر اقوام کی تقلید کریں؟ اگر ہم مذہب اور طبیعت وفطرت کے بتائے ہوئے طریقے پر عورتوں کی اصلاح حال کا قانون مقرر کریں تو کیا معزز مسلمان خاتون کے دل پر اس کا کوئی ناگوار بوجھ پڑے گا۔ افسوس اب گویا ہم پر امید وفلاح کے دروازے ہر طرف سے بالکل بند ہو چکے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم مجبور ہو کر دوسری قوموں کی مہلک بیماریوں میں بھی ان کی تقلید کرنے پر مستعد ہو گئے ہیں۔

❋ ❋ ❋

کیا عورت کا مرد کے کاموں میں دخل دینا ممکن بھی ہے؟

خالق عالم ایک بات میں اٹل فیصلہ فرما چکا ہے کہ:

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ (۶۵:۱)

خدا کی حد بندیوں سے جس نے تجاوز کیا، خود اپنے نفس پر ظلم کیا۔ جو لوگ عالم کون و فساد کے انقلاب کا علم رکھتے ہیں ان کا مقولہ ہے کہ طبیعت میں ایک ایسا خاص نظام موجود ہے جہاں انسان کے حدود سے متجاوز ہونے یا اس کے توڑنے کا ارادہ کرتا ہے، خود طبیعت ہی اسے فوراً روک دینے والی باتیں فراہم کر دیتی ہے، یہاں تک کہ یا انسان اس قصد سے باز آ جاتا ہے یا اپنے کیے کی سزا پاتا ہے۔ جس وقت سے انسان کا وجود ہوا ہے اس دن سے آج تک اگر اس کی زندگی پر غور کیا جائے تو اس کو ایک عظیم الشان تعلیم گاہ کی طرح پائے گا جس میں ہر وقت انسان کو راہ راست کی تلاش کی خواہش ہونے کی صورت میں تعلیم پانے کا موقع حاصل ہے۔

ہم اگلی بحث میں یہ مسئلہ بخوبی ثابت کر چکے ہیں کہ عورتوں کا مردوں کے اشغال میں شریک ہونا ایک معاشرت کی بیماری اور قوانین فطرت کی خلاف ورزی ہے اور صرف ایک بحث اس امر کے ثبوت کے لیے کافی تھی کہ گو اس ناموس الٰہی کی نافرمانی کو کیسے ہی خوشنما ظاہر داریوں سے چھپایا جائے تاہم اس کا ہمیشہ قائم رہنا محال ہے لیکن زیادہ واضح کرنے کے خیال سے ہم پھر اس کی توضیح کرتے ہیں نہ صرف ہم بلکہ تمام خاص و عام یہاں تک کہ عالم وجود کا ایک ذرہ بھی جانتا ہے کہ عورت کے لیے ایک خاص کمال ایسا رکھا گیا ہے کہ جب تک وہ بیاہی ہوئی اور بچہ جننے والی، اس کو پرورش کرنے والی ماں اور خانہ داری کی منتظم نہ بنے اس وقت کبھی وہ کمال حاصل نہیں ہو سکتا اور جو چیز اس کو قدرتی فرض سے دور کرے گی وہ اس کے کمال میں بھی نقص وارد کر کے اس پر برا اثر

ڈالے گی۔ ہمیں اس بات کا بھی علم ہے کہ انسانیت آگے ترقی کر رہی ہے پسپا نہیں ہو رہی ہے اور یہ ترقی اسی وقت ممکن ہے جبکہ انسان کے سارے ارادے اور حالات قوانین فطرت سے مطابق ہوتے رہیں۔ اسی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ کوئی قوم کامل نہیں بن سکتی تاوقتیکہ اس میں کاموں کی تقسیم نہ کر دی جائے؟ یہ تقسیم دو کارکن قوتوں کے حسب حال ہونی چاہیے یعنی استعداد اور خلقی فرائض مثلاً اگر ہم سنیں کہ فلاں قوم کی عورتیں خانہ داری کی زندگی کے دائرے سے نکل کر مردوں کے ساتھ سخت محنت کے کاموں میں شریک ہوتی ہیں تو اگر ہماری آنکھیں بینا اور ہمارے دل صحیح ہوں ہمیں اس بات کو ہرگز ایسا کمال تصور نہ کرنا چاہیے جس کے حاصل کرنے کے لیے ہم اس پر اس قوم کی پیروی واجب ہے بلکہ بجائے اس کے ہمارا یقینی فرض یہ ہونا چاہیے کہ ہم اس کو موجب ضرر تصور کر کے اس سے دور رہنے کی کوشش کریں کیونکہ یہ امر صحیح کمال کے منافی ہے، خواہ وہ قوم بہ نسبت ہمارے تمدن کے بعض نمائشی حالتوں میں فوقیت کیوں نہ رکھتی ہو۔ دنیا میں بہت سے تمدن قائم ہوئے۔ کچھ زمانہ تک ان کو فروغ ہوا، روئے زمین ان کے جلوؤں سے روشن ہو گئی پھر افراد قوم کی خلاف ورزی اور احکام فطرت کی مخالفت سے آخر کار یوں مٹ گئے کہ گویا وجود ہی میں نہ آئے تھے۔ یہ ایک قضیہ ہے کہ خود ”مراۃ الجدیدہ“ کے مصنف بھی اس بارے میں ہم سے مخالفت نہیں رکھتے چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

”ہم اس بارے میں بالکل اختلاف نہیں کرتے کہ فطرت نے عورت کو خانہ داری کے کاموں اور اپنی اولاد کی پرورش کے لیے پیدا کیا ہے اور وہ حمل، ولادت اور رضاع کے ایسے سخت طبعی عارضوں میں مبتلا ہوتے رہنے کی وجہ سے ان کاموں کو نہیں کر سکتی جو مرد کر سکتے ہیں، بلکہ ہم اس مقام پر بھی تصریح کیے دیتے ہیں کہ سوسائٹی کی جو بہترین خدمت عورت ادا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ عورت بیاہی جائے، بچے جنے اور اپنی اولاد کی تربیت کرے اور یہ ایسا بدیہی قضیہ ہے جس کے ثابت کرنے کے واسطے کسی طویل بحث کی حاجت نہیں۔“

اس مقام پر مؤلف بھی ہماری ہی طرح یہ مانتے ہیں کہ عورت کا کمال اس میں ہے کہ وہ ایسی

بیوی بنے جس کے چند بچے ہوں اور پھر وہ ان کی تربیت میں مصروف ہو لیکن اس بات کو لکھ کر وہ پھر مکر جاتے ہیں اور لکھتے ہیں:

"مگر غلطی تو یہ ہے کہ ہم اس کی بنیاد پر عورت کے لیے ایسی تعلیم و تربیت کو لازم قرار دیں جس کے ذریعہ سے وہ بوقت ضرورت اپنی اور اپنے چھوٹے بچوں کی زندگی کے واسطے کسب معاش کر سکے۔"

ہم کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی معاشرت کی حالت یورپ کے طرز معاشرت سے ہر طرح سے جداگانہ ہے اور جو شخص اس بات کی تحقیق کرنا چاہے اس کو ادنیٰ تامل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان دونوں خطوں کا کسی تمدنی اصولوں میں یکساں اور ملتے جلتے ہونا اس وقت تک غیر ممکن ہے جب تک کہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے جسم میں فنا ہو کر اسی کا ایک جزو نہ بن جائے؟ اس میں شک نہیں کہ فاضل مولف نے جو آخری جملہ لکھا ہے اگر یہ فقرہ یورپین ممالک میں کسی کی زبان سے نکلتا تو وہاں کے ہر ایک دل میں اس کی بہت بڑی وقعت جم جاتی مگر اس وجہ سے نہیں کہ یہ بات کسی واجب الوصول کمال حاصل کرنے کی کوشش کا حکم دیتی ہے بلکہ اس لیے کہ یورپ میں کوئی گھرانہ ایسا نہیں مل سکتا جس میں کوئی لڑکی یا عورت بطور خاص خارجی کاموں میں حصہ نہ لے رہی ہو لیکن مشرقی ممالک ہمیشہ سے عورتوں کے بارے میں کمال فطری کے درجہ سے بہت قریب رہتے آئے ہیں۔ اس لیے یہ فقرہ اس ملک میں ہرگز قبول عام کا مرتبہ نہیں حاصل کر سکتا بلکہ یہاں معاملہ برعکس ہے کیونکہ مشرقی ملکوں میں جتنے کنبے قبیلے ہیں وہ اس دن کو بے حد منحوس تصور کرتے ہیں جس میں اس کی کسی عورت کو خارجی کام کے لیے مجبور ہونا پڑے اور خدا سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ پروردگار ایسا روز بد آنے سے پہلے ہی ہم کو دنیا سے اٹھا لے۔

ایک یورپین شخص کو معلوم ہے کہ اس کے ملک میں ایسی عورتوں کی کثیر تعداد موجود ہے جو اپنے کمسن بچوں کی پرورش اور اپنے بسر اوقات کا کوئی ذریعہ نہیں رکھتیں۔ فاقہ اور تنگ دستی کی

مصیبت نے ان کو زندگی سے بیزار اور موت کا طلبگار بنا دیا ہے اور اکثر بیچاریاں بھوکوں مرنے کی آفت سے نجات پانے کے واسطے خودکشی بھی کر لیتی ہیں۔ اس لیے جب وہ مذکورہ بالا جملے کو سنے گا تو اس کے دل پر گہرا اثر پڑے گا اور اس کو لامحالہ یہ آرزو پیدا ہو جائے گی کہ کاش تعلیم کی وجہ سے ایسی ہی صورت ظہور میں آ جاتی اور غریب عورتوں کو محرومانہ زندگی سے نجات مل جاتی مگر مشرق کا رہنے والا آدمی جس نے آج تک باوجود ہر حیثیت سے پستی و ذلت میں گرفتار ہونے کے ایسا رنجیدہ منظر نہیں دیکھا ہے، ضرور اس جملہ کو نہایت حقارت و نفرت سے دیکھے گا اور اس کو کبھی نہ مانے گا کیونکہ اس کے دل میں اسلام کی شریف روح کا اتنا اثر باقی ہو گا جو اسے خیال دلائے گا کہ کاش! ہمارے قومی مرد کسی دوسری تدبیر سے ان عورتوں کی تکلیف رفع کرنے کا سامان کرتے۔

❋❋❋

عورتوں کو مردوں سے پردہ کرنا چاہیے

ہم ثابت کر چکے ہیں کہ عورت کے لیے دنیا میں ایک ایسا کمال رکھا گیا ہے جس کے حاصل کرنے کی کوشش اس پر فرض ہے اور تجربہ کی واضح دلیلوں سے اس بات کو بھی دکھا چکے ہیں کہ عورت کا مردوں کے کاروبار میں مصروف ہونا اور خود اپنی روٹی کمانے کے لیے محنت ومشقت کرنا علاوہ اس کے کہ اسے اپنے مرتبہ کامل سے دور ڈال دیتا ہے۔اس کی تمام ایسی خاصیتوں کے لیے بھی سم قاتل ہے جو اسے سعادت سے بہرہ ور کرتی ہیں اور اس کی بربادی اور تباہی کا موجب یہی امر ہے اور اس بات کا بھی فلسفی دلیلوں سے ثبوت دے چکے کہ عورت کو مرد کی ذمہ داری میں رہ کر اسے اپنی غذا اور سامان آسائش کی بہم رسانی پر مجبور کرنا چاہیے اور اپنا کام صرف یہ سمجھنا چاہیے کہ بچوں کی پرورش اور پرداخت کرے۔غرض یہ کہ ان سب باتوں کو پچھلی باتوں میں بوضاحت بیان کر چکنے کے بعد اب ہم یہ کہتے ہیں کہ ان تمام اہم حقوق کے مقام میں جو مرد پر عورت کے لیے مقرر کیے گئے ہیں، مرد کا بھی کوئی حق اس پر ضرور ہونا چاہیے اور وہ حق یہ ہے کہ عورت مرد کی افسری مانے اور اسے اپنا سرتاج جانے ورنہ اگر مرد پر اتنے واجبات کا بار ڈال کر اسے معاوضہ میں اس کا طبعی حق بھی نہ دیا جائے تو یہ بات نظام عالم کے اصول کے خلاف ہوگی بلکہ ہمارے خیال میں مرد کا یہ حق جو اس کو عورت پر حاصل ہے، زیادہ واضح کرنے کا محتاج نہیں یہ ایک فطری احساس ہے جس کو خود عورت بلا کسی تحریک کے محسوس کر لیتی ہے اور مرد بھی اس کا بدیہی ثبوت رکھتا ہے۔اس لحاظ سے عورت کو پردہ میں رکھنا یا اسے پردہ سے باہر نکال لانا خود مرد کے قابو کی بات ہے جس کو بلا اعانت غیرے جب دل چاہے کر سکتا ہے۔یہ بالکل فضول سی بات ہے کہ ہم مرد پر اتنے فرائض کا بار ڈالنے کے بعد پھر اسے ان حقوق سے بھی بے بہرہ بنانے کی سعی کریں جو اس کو اپنی بیوی پر حاصل

ہونے چاہئیں اور یہ ایک ایسی بات ہے جو دنیا میں کبھی صورت پذیر ہی نہیں ہو سکتی کیونکہ دنیا کا کاروبار اسی برتے پر چلتا ہے کہ اس کے تمام افراد میں تبادلہ حقوق ہوتا رہے۔ ہر ایک مخلوق ایک دوسرے پر کچھ نہ کچھ حق رکھتی ہے اور ایک کی مدد و اعانت سے دوسرے کا کام چلتا ہے کہ اس لیے جو شخص عورت پر مرد کے حقوق قائم کرنے پر اعتراض کرتا ہے وہ گویا خود قانون قدرت پر اعتراض کرنے کا عادی ہے تاہم اس کا بے نتیجہ فعل ہونا اظہر من الشمس ہے ورنہ اگر انسان کسی چیز کے حاصل کرنے سے پہلے اس بات پر بھی غور کر لیا کرتا کہ آیا قانون قدرت کے بھی حسب منشاء ہے یا نہیں، تو غالباً ہم کو اپنی لغتوں سے ''ناممکن'' کا لفظ نکالنا پڑتا اس لیے کہ دنیا میں کوئی چیز محال نہیں مگر وہ جو کہ قانون قدرت کے خلاف ہے۔

عورت کو پردہ میں رکھنے یا پردہ سے باہر لانے کا حق براہ راست مرد کو حاصل ہے اور اس کی ایک کھلی ہوئی دلیل یہ ہے کہ عورتوں کو آزادی دلانے والے جب کبھی اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں یا اس کو آزادی دینے کا مطالبہ کرتے ہیں تو ان کا روئے سخن ہمیشہ مرد ہی کی جانب ہوتا ہے۔ کتاب ''مراۃ الجدیدہ'' کے مؤلف تحریر فرماتے ہیں:

> ''ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں اہل علم کے لیے اور خاص کر نوخیز تعلیم یافتہ جماعت کے لیے جس سے زمانہ آئندہ میں ہماری امیدیں پوری ہونے کا سہارا وابستہ ہے کیونکہ صرف یہی جماعت جس نے صحیح علمی تربیت حاصل کر لی ہے اس بات کی قوت رکھتی ہے کہ ایک نہ ایک دن مسئلہ نسواں کو بحث اور توجہ کے اس مرکز پر لے آئے جس کا یہ مسئلہ مستحق ہے۔''

کیا اب اس جملہ کو پڑھ کر بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ عورتوں کی باگ مردوں کے ہاتھوں میں نہیں اور یہ کہ مردوں کو اس بات کا اختیار ہے کہ جس راستے چاہیں عورتوں کو چلا سکتے ہیں اور جس طریقہ پر ارادہ کریں ان سے اپنے حسب مرضی کام لے سکتے ہیں کیونکہ اگر اس حیثیت سے عورتوں کا بھی کوئی طبعی حق ہوتا ہے جسے میزان عالم میں کوئی وزن حاصل ہو تو ضروری تھا کہ فاضل مؤلف ان کو اپنا صحیح مخاطب بنا کر ہدایت کرے کہ عورتو! مردوں کی اطاعت کا جوا اپنی گردنوں سے

اتار پھینکو کیونکہ وہ عورتیں خود ہی کیوں اس بات کی منتظر رہتیں کہ ان کا کوئی مرد حامی اٹھے۔ وہ آپ ہی مردوں کے چنگل سے نہ نکل بھاگتیں، جو لوگ عورتوں کو مردوں کی اطاعت سے آزادی دلانے کے واسطے لکھا کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے بعض کمزور اور محکوم اقوام کے کچھ افراد زبردست اور حکمران قوم کے غلبہ اور حکمرانی کو قبضہ غاصبانہ بنا کر اپنے استقلال اور آزادی کا غل مچاتے ہیں مگر اس شور وغوغا کا اس وقت تک کوئی اثر نہیں ہوسکتا جب تک مغلوب قومیں خود کوئی ایسا وزن دار طبیعی حق حاصل نہ کرلیں جو انہیں خود مختاری کے لائق نہ بنا سکے۔ اس صورت میں عورتوں کو آزادی دلانے والوں کی تحریریں پادر ہوا سے زیادہ نہیں کیونکہ نہ عورتوں کو فطرتاً کوئی ایسا حق حاصل ہوگا اور نہ ان حضرات کی امید بر آئے گی۔ علاوہ بریں ہماری یہ مثال قیاس مع انفارق ہے کیونکہ وہ محکوم قومیں جدوجہد کے ذریعے سے اس فطری حق کو حاصل کرنے کی قوت رکھتی ہیں جس کے بعد انہیں حکمران قوم کی ماتحتی سے نکلنے کا موقع مل جائے گا مگر عورتوں کی حالت اس کے برعکس ہے۔ عورتوں کا کمال اسی امر کا مقتضی ہے کہ مرد ان کی خدمت گزاری کریں، ان کی غذا اور راحت کا سامان بہم پہنچائیں اور انہیں کسب معاش کی مہلک جنگ میں شریک ہونے سے بچائیں۔ اتنی اور ایسی گراں بار خدمت کسی معاوضہ کی بھی مستحق ہے۔ وہ معاوضہ کیا ہے؟ یہی کہ مرد کو عورت پر افسری اور تحفظ کا حق دیا جائے۔ باوجود اس امر کے ہم یہ نہیں کہتے کہ عورتیں ایسی خود مختار نہیں ہوسکتی ہیں جن کی آزادی پر مرد کا کوئی دباؤ نہ پڑ سکے لیکن ایسی حالت میں مرد کو اس بات کی کچھ پروا نہ ہوگی کہ عورت کے فرائض اور حقوق کا بار اپنے ذمہ لے۔ اس لیے وہ عورت کو اس کے حال پر چھوڑ دے گا تاکہ عورت اپنی بسر اوقات کا آپ ہی سامان کرلے اور اس صورت میں عورت خارجی کاروبار میں مرد کی مزاحمت سے صدمہ اٹھائے گی اور جس طرح آج سے ہزاروں سال قبل یا آج بھی وحشی قوموں میں دیکھا جاتا ہے، عورت آزاد اور خود مختار رہے گی لیکن اسی کے ساتھ حد درجہ کی ذلیل وحقیر مخلوق بن کر۔ لہٰذا اگر عورتوں کی آزادی والے اصحاب اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ عورت کو ایسے جلتے ہوئے جہنم میں جھونک دیں تو ہم خدائے پاک سے التجا کریں گے کہ بارالٰہا تو یہ قہر ہم پر نازل نہ فرما۔

جن قوموں کی نسبت لوگوں کا خیال ہے کہ ان کی عورتیں اعلیٰ درجہ کی آزادی حاصل کر چکی ہیں اگر ان کی حالت پر سرسری طور سے غور کیا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ وہ موہوم آزادی براہ راست مردوں کے قابو میں ہے یعنی اگر آج وہاں کے مرد عورتوں کو گھروں میں بند کر دینا چاہیں تو عورتیں بجز اطاعت کے کچھ نہیں کر سکتی ہیں اور جس طرح وہ پہلے زمانہ میں آج تک ہمیشہ مردوں کی فرمانبرداری کرتی رہیں اور کرتی رہتی ہیں۔ اس بارے میں کوئی انکار نہ کر سکیں گی۔ یہ ایسی حقیقتیں ہیں کہ خواہ کوئی اپنی زبان سے ان کا اقرار نہ کرے تاہم اس کا دل ضرور انہیں مان لے گا اور اس کے بشرہ سے پتہ چل جائے گا کہ ان کی صداقت اس کے قلب پر نقش کالحجر ہو گئی ہے۔

کتاب ''المراۃ الجدیدہ'' کے مولف فرماتے ہیں:

''جب مردوں کا معاملہ باعث فساد تھا تو اس کی کیا وجہ ہے کہ عورتوں کی آزادی پامال کی جاتی ہے، کیا عورتوں اور مردوں کی خودمختاری عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے، کیا عورتوں اور مردوں کے بارے میں انصاف کی دو مختلف نگاہیں ہونی چاہئیں۔ کیا ہر ایک ذی اختیار کو اس بات کی آزادی نہیں حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہے اپنا اختیار صرف کرے بشرطیکہ اس کا فعل شرع و قانون کی حد سے آگے بڑھے۔''

ہم کہتے ہیں کہ یہ بات بھی ویسی ہی فضول ہے جیسی محکوم اور مغلوب قوموں کی چیخ و پکار۔ وہ بھی تو یہی چلاتی رہتی ہیں کہ جب انسان کو زندگی کے میدان میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا جائز حق ہے تو کیا وجہ ہے کہ کمزور اور محکوم قوموں کی راہ میں رکاوٹیں حائل کی جاتی ہیں اور فاتح قوموں کے بڑھنے کے لیے راستہ صاف بنایا جاتا ہے۔ کیا ان کے واسطے کچھ اور انصاف ہے اور ان کے لیے کچھ اور؟ کیا حاکم اور محکوم قوموں کے حقوق الگ الگ ہیں؟ کیا ہر ایک ذی اختیار کو اپنے جائز حق سے فائدہ اٹھانے کا پورا موقع نہیں دیا گیا ہے، بشرطیکہ وہ قانون کی حد سے تجاوز نہ کرے وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے اگر ایسی شکایتیں کمزور قوموں کے لیے نافع ہوتیں اور انہیں زبردست قوموں کے ہاتھوں سے نجات دلا دیتیں تو ہم مان لیتے کہ عورتوں کی نسبت بھی ایک ایسا

جملہ کوئی اثر دکھائے بغیر نہ رہتا۔ آخر اس کے مفید نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟ یہی کہ اسرار فطرت کا معائنہ اور تجسس۔ انسانی زندگی کے قوانین پر غور کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ دو چیزوں میں مساوات اسی وقت پائی جاتی ہے جبکہ ان کی قوت کافی اور یکساں ہو۔ یہ ایسا بدیہی قضیہ ہے جس کو ہر شخص اپنے معاملات زندگی اور دوسری قوموں کے بسر اوقات کی حالت میں مشاہدہ کر سکتا ہے، اس لیے ہمیں مساوات کا نام لے کر گفتگو کرنے سے قبل یہ واجب ہے کہ اس بارے میں قوت کی یکسانیت کا بھی لحاظ کریں اور ہمارے مخالفین کسی طرح اس قانون قدرت کو ظالمانہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ظلم اور سخت ظلم اس کا نام ہے کہ دو مختلف قوتیں رکھنے والے افراد کو مساوی حقوق دلائے جائیں۔

ایسی باتوں کے غیر مفید ہونے کا فقط یہی ایک باعث نہیں جو ہم نے ذکر کیا بلکہ ایک دوسری بات یہ بھی ہے کہ وہ گفتگو کسی اور امر سے تعلق رکھتی ہے اور واقعی حقیقت کچھ اور ہے۔ اصل یہ ہے کہ خداوند کریم نے مرد اور عورت کو الگ الگ کامل نہیں بنایا بلکہ دونوں کو ملا کر فرد کامل بننے کے لیے پیدا فرمایا۔ مرد کی ذات پر چند بڑے نقصانات اور کمیاں ایسی ہیں جن کی تکمیل صرف عورت کر سکتی ہے اور عورتوں کی ذاتی کمی مرد کے ذریعہ سے پوری ہوتی ہے مگر اس کے لیے یہ امر بھی شرط ہے کہ باہم تبادلہ پذیر کمیاں براہ راست دونوں کے باہم ملنے کے وقت خود بخود مکمل ہو جایا کریں اور وہ حالت بذات خاص میاں بیوی دونوں کو ان کے فرائض سے واقف بنا دے جو ایک دوسرے پر ہیں۔ جب یہ بات قرار پائی تو اب دو ایسی چیزیں ہیں جو ہر ایک دوسرے کی محتاج ہیں مساوات کی حد مقرر کرنے پر بات بڑھانا ایک بے معنی بات ہے اور دونوں میں سے ہر ایک کے علیحدہ علیحدہ مستقل ہونے کے مسئلہ پر بحث کرنا ایک ایسی چیز ہے جو میری سمجھ میں مطلقاً نہیں آتی۔ جو دو چیزیں مل کر ایک شے ہونے کے لیے پیدا کی گئی ہوں اور ہم ان کو الگ الگ بجائے خود مستقل بنانا چاہیں تو اس میں کیا خوبی نکل سکتی ہے جو دو چیزیں ایک دوسرے کی محتاج الیہ ہیں۔ ان میں ہم مساوات کا درجہ کیونکر قائم کر سکتے ہیں؟ زیادہ سے زیادہ اس بارے میں جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں وہ بات یہ ہے کہ جو لوگ مرد و عورت کو الگ الگ مستقل بالذات بنانے کی جدوجہد

کرتے ہیں ان کا مدعا دو ایسے عنصروں کو مستقل بنانے کی جدوجہد سے ملتا جلتا ہے جن کی آمیزش سے پانی بنتا ہے یعنی وہ آکسیجن اور ہائیڈروجن کی متفقہ قوت سے ہر ایک کو مستقل بالذات بنانا چاہتے ہیں اور اسی کے ساتھ یہ بھی آرزو رکھتے ہیں کہ یہ عناصر پانی بھی بناتے رہیں۔ اس لیے اگر یہ بات ممکن ہے تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ مرد و عورت الگ الگ مستقل ہو جانے کے باوجود گھرانے کی بھی تسکین کا سامان کرسکیں گے۔

ہاں اس موقع پر یہ لوگ کہیں گے کہ جب تم عورت و مرد کو ایک ہی چیز یا ایک دوسرے کا محتاج الیہ قرار دیتے ہو تو پہلے ابواب میں خود تم نے ہی ان کے الگ الگ مرکز کیوں مقرر کیے ہیں اور ان کو مختلف بنانے کی کیوں کوشش کی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا یہ فعل پیدا ہونے کے اسباب اور ہائیڈروجن کے خواص و حالات کی الگ الگ جانچ اور تحقیقات کرتا ہے۔ اس لیے اگر ہم نے عورت کو بہ نسبت مرد کے کمزور بیان کیا تو ایک عالم علم کیمیا بھی یہی کہتا ہے کہ آکسیجن بہ نسبت ہائیڈروجن کے زیادہ وزنی ہوتا ہے اور ہم نے یہ کہا ہے کہ زندگی پر وزن قائم رکھنے والا قانون اور جنس نازک (عورت) کی بہتری صرف اسی امر کی مقتضی ہے کہ گھر کی بنیاد رکھنے میں عورت بہ نسبت مرد کے کئی حصے زیادہ اپنی آزادی کی قربانی پر چڑھا دے تو فن کیمیا کا ایک ماہر بھی کہے گا کہ پانی بنانے کے لیے ہائیڈروجن کو بمقابلہ آکسیجن کے اپنی زیادہ مقدار صرف کرنی پڑتی ہے۔

یہ سخت حیرت کی بات ہے کہ عورتوں کو آزادی دلانے کے خواہشمند حضرات اس بات کو نہایت بری بات تصور کرتے ہیں کہ عورت مرد کی تابع ہے اور اسے عبودیت اور اسیری کی زندگی سے تعبیر کرتے ہیں مگر اس پر ذرا دیر کے لیے بھی غور نہیں کرتے کہ مرد اپنی عورت کے نان ونفقہ کے لیے کس قدر محنت اور مشقت اٹھاتا، اپنے تئیں جان جوکھوں میں ڈالتا اور اپنا آرام کھوتا ہے۔ گویا مرد کی یہ محنت کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی۔ اسی کے ساتھ اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے ایک طرف عورت کی اطاعت اور دوسری ان روحانی اور جسمانی محنتوں اور تکلیفوں کو جو اپنی عورت کی آرام رسانی کے لیے برداشت کرتا ہے، ایک دوسرے کے مقابلہ پر رکھ دیں تو ہمیں صاف نظر آجائے گا کہ

عورت کی غلامی محض نام کے لیے ہے ورنہ دراصل مرد عورت کا غلام بلکہ غلام سے بڑھ کر ہے۔ ہاں بکثرت دیکھا جاتا ہے کہ عورت پر مرد کی اطاعت کا بار اس کے لیے رنج والم کا باعث اور پریشانی واضطراب کا موجب ہے تو یہ صرف ان دونوں کی نادانی اور حماقت کا کرشمہ ہے ورنہ تہذیب و تربیت سے آراستہ بیویوں اور شوہروں میں سے ہر ایک دوسرے کی نظر میں معزز بن جاتا ہے اور خود ان کی طبیعتیں اپنے اپنے فرائض متعین اور تقسیم کر لیتی ہیں جس کے بعد استقلال، آزادی اور خود مختاری کے لفظ ان کے خیال میں بھی نہیں آتے کیونکہ دو فرد جو ایک دوسرے کی تکمیل کرنے اور باہم مل کر رہنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں ان کے مابین یہ الفاظ بے معنی ہیں۔ ان تمام باتوں کے مقرر ہو جانے اور ثابت ہو جانے کے بعد کہ مرد و عورت ایک دوسرے کے بالمقابل کوئی آزادی نہیں رکھتے بلکہ وہ دونوں ایک ہی شے ہیں۔ اب عورت کے پردہ میں رہنے کا مسئلہ اس کے اور مرد کے مابین مشترک بن گیا۔ اس لیے تنہا عورت کو پردہ کی رسم مٹا دینے کا حق نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ مرد بھی اس بات کو نہ مان لے۔

اب یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا لوگ واقعی کہتے ہیں کہ پردہ دراصل ذلت اور اسیری کی علامت ہے اور کیا پردہ عورت کو اس کے درجہ کمال تک پہنچنے سے روکتا ہے۔ اس کے جواب میں آگے ملاحظہ فرمائیے۔

❋ ❋ ❋

پردہ قید کی علامت ہے یا آزادی کی ضمانت؟

گزشتہ ابواب میں ہم نے بہت تشریح کے ساتھ عورت کی ماہیت اور اس کے کمال کو بیان کر دیا ہے اور ٹھوس کی دلیلوں سے ثابت کر دکھایا ہے کہ وہ کمال عورت کو جب ہی حاصل ہو سکتا ہے جبکہ وہ مردوں کے کاموں میں دخل نہ دے۔ ہم نے بڑی چھان بین کے ساتھ ان مضرتوں کو بھی دکھایا ہے جو عورت و مرد دونوں جنسوں کے باہم میل جول سے روزمرہ ظہور میں آتی رہتی ہیں اور اس باب میں ہمارا یہ ارادہ ہے کہ ہم پردہ کو عورت کے استقلال، اس کی آزادی اور اسے مرد کے بے جا غلبہ سے باز رکھنے کا واحد ذریعہ اور آلہ ثابت کر دکھائیں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔

جس وقت ہم ایک ایسے عمرانی موضوع پر بحث کر رہے ہوں جیسا کہ مسئلہ نسواں ہے تو ہمیں چند روزہ مادی مدنیت کے نظر فریب چمک دمک سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے اور جب تک ہر چیز کی اچھی طرح چھان بین نہ کر لیں اس وقت تک اس حکم کو قائم کرنے کا اصول قرار نہ دینا چاہیے۔ اس بیان سے ہماری مراد یہ ہے کہ یورپ کے تمدن کی جس ظاہر فریب نمائش سے یورپین عورتیں لطف اٹھا رہی ہیں۔ اس کے دل فریب رنگ کو پختہ اور لازوال تصور کرنا ٹھیک نہیں یہ ایک عمرانی غلطی ہے جو تجسس آدمی کو چار و ناچار بعض ایسے بے معنی اور سطحی ادراکات کی طرف کھینچ لے جاتی ہے جن کو حقیقت اور واقعیت سے کچھ بھی لگاؤ نہیں ہوتا اور اگر بحالت موجودہ کچھ عرصہ کے لیے وہ موافق بھی ہو جائے تو زمانہ آئندہ میں پھر اس کی ناموافقت عیاں ہو جائے گی۔ اس لیے وہ فطرت بشری سے منطبق نہیں ہوتی اور گو مرد کی غیرت تھوڑی دیر کے لیے لہو و لعب کی خاک میں دب گئی ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ بالکل فنا ہو چکی ہے۔ نہیں کسی نہ کسی دن پھر اس کا شعلہ بھڑکے گا اور عورتوں کی اس آزادی کو جلا کر خاک سیاہ بنا ڈالے گا۔ جن لوگوں نے انسان اور انسانیت کی

مجموعی حالتوں پر عام نظر نہ ڈالی ہو گی ان کو میری یہ بات شاعرانہ خیالات کی طرح بیکار بلند پروازی معلوم ہو گی لیکن کچھ ایسے لوگ بھی ملیں گے جو میری اس بات کو حقیقتاً صحیح اور عقل کے نزدیک قابل درست سمجھنے کے علاوہ تاریخی شواہد سے مدلل بھی تصور کریں گے چنانچہ اس مقام پر ہم مثالاً رومن ایمپائر کی حالت کا نقشہ کھینچ کر دکھاتے ہیں۔ کون رومن ایمپائر؟ جو تمام دول یورپ کی ماں ہے اور وہ پہلا سرچشمہ ہے جس سے موجودہ یورپ کی متمدن دول عظام کی نہریں نکلیں۔ رومن حکومت کی بنیاد شہر روما میں چھ صدی قبل مسیح پڑی تھی۔ ابتداء یہ حکومت بہت چھوٹی مفلس اور بے حقیقت تھی پھر کئی صدیوں تک رفتہ رفتہ ترقی کرتی ہوئی تمدن وتہذیب کے اعلیٰ درجہ تک پہنچ گئی۔ اس حکومت میں بھی عورتیں پردہ کی قید میں رکھی جاتی تھیں۔ انیسویں صدی کے انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ:

''رومانیوں کی عورتیں بھی اسی طرح کام کاج کو پسند کرتی تھیں جس طرح مرد پسند کرتے ہیں اور وہ اپنے گھروں میں کام کرتی رہتی تھیں۔ ان کے شوہر اور باپ بھائی صرف میدان جنگ میں سرفروشی کرتے رہتے تھے۔ خانہ داری کے کاموں سے فراغت پانے کے بعد عورتوں کے اہم کام یہ تھے کہ وہ سوت کاتیں اور اون کو صاف کر کے ان کے کپڑے بنائیں۔ رومانی عورتیں نہایت سخت پردہ کیا کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ ان میں جو عورت دایہ کا کام کرتی تھی وہ اپنے گھر سے نکلتے وقت بھاری نقاب سے اپنا چہرہ چھپا لیتی اور اس کے اوپر ایک موٹی لمبی چادر اوڑھتی جو ایڑی تک لٹکتی رہتی پھر اس چادر پر بھی ایک عبا اوڑھی جاتی جس کے سبب سے اس کی شکل نظر آنا تو کیا جسم کی بناوٹ کا بھی پتہ لگنا مشکل ہوتا تھا۔''

اس زمانہ میں جبکہ رومانیوں کی عورتیں پردہ میں رہا کرتی تھیں، اس قوم نے ہر فن اور جملہ کمالات میں بے نظیر ترقیاں کیں۔ بت تراشی، عمارت سازی، فتوحات ملکی، سلطنت وحکومت، عزت وعظمت اور علم وہنر میں ساری دنیا کی قومیں رومانیوں کے مقابلے میں ہیچ ہو گئیں لیکن اس مرتبہ پر پہنچنے کے بعد ان میں عیش پرستی اور کھیل وتفریح کا شوق پیدا ہوا جس کے ضمن میں انہوں نے اپنی عورتوں کو پردہ کی قید سے آزادی بخشی تاکہ وہ بھی ان کے ساتھ لہو ولعب اور سیر وتفریح کی مجلسوں، دنگلوں اور

اکھاڑوں میں شریک ہوں۔ عورتیں پردہ سے نکلیں لیکن کیونکر؟ اس طرح جیسے پہلو سے دل نکل جاتا ہے پھر کیا تھا اس حملہ آور عنصر (مرد) نے موقع پایا کہ محض اپنے حظ نفس کے لیے ان کے اخلاق خراب کر کے ان کی پاکیزگی کے دامن پر داغ لگائے اور ان کی شرم وحیا کو توڑا۔ یہاں تک کہ پھر وہی عورتیں جو سات پردوں میں رہا کرتی تھیں، تھیٹروں میں جانے لگیں۔ بال اور رقص کے جلسوں میں عورتوں کے ناچنے اور گانے کا مشغلہ ایجاد ہوا۔ آخر عورتوں کی حکومت اس قدر قوی ہوئی کہ جو نامور مرد تدبیر ملک داری اور انتظام سلطنت کے لیے پارلیمنٹ یا سینٹ کی مجلس میں ممبر منتخب ہوا کرتے تھے وہ بھی عورتوں کے ووٹ حاصل کرنے سے مقرر ہوتے اور ان کے معمولی اشاروں پر اپنے عہدوں سے معزول کر دیے جاتے۔ پس یہ حالت ثابت ہوتے ہی رومانی حکومت کی بربادی شروع ہو گئی اور اس پر ایسی تباہی آئی کہ تاریخ کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص اس بات کو دیکھ کر حیرت زدہ اور مبہوت ہو جاتا ہے کہ رومانی حکومت کے اس شاندار قصر اور مستحکم عمارت کی انہیں عورت کے نازک ہاتھوں نے کس طرح ایک ایک اینٹ اکھیڑ کر رکھ دی اور اس کی ساری عظمت ومتانت خاک میں ملا دی۔ کیا یہ بات عورتوں نے اپنی بدنیتی اور بداخلاقی سے کی نہیں! اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا مگر بات یہ ہوئی کہ انہیں بے پردہ بنایا گیا تو باقتضائے فطرت مردان پر مائل ہونے لگے اور اس کے لیے آپس میں کٹنا مرنا شروع کر دیا۔ یہ ایک ایسی سیاسی حقیقت ہے جس کے ماننے میں کوئی شخص بھی بحث کر سکتا۔ علامہ لوئس پیرول ریویو آف ریویوز'' جلد ا میں'' پولیٹکل فساد کے عنوان سے لکھتا ہے:

''سیاسی امور اور پولیٹکل اصول میں خرابی پڑنے کی مثالیں ہر ایک زمانہ میں یکساں پائی گئی ہیں اور جو بات سخت حیرت میں ڈال دینے والی ہے وہ یہ ہے کہ اگلے زمانہ میں فساد کی جو علامتیں پائی گئی تھیں وہ آج کل بھی بجنسہٖ نظر آ رہی ہیں یعنی یہ کہ اعلیٰ درجہ کے اخلاق کی بنیادیں منہدم کرنے کی سب سے زیادہ باعث عورت رہی ہے۔''

مگر ہمارے خیال میں اس فاضل مضمون نگار کو فساد ڈالنے کا الزام عورت کے ذمہ عائد کرنے سے باز آنا بہتر تھا کیونکہ عورت بذات خود ہرگز مفسدہ پرواز نہیں بلکہ مفسدہ انگیز اور

شرارت مرد کا حق ہے۔ البتہ وہ اپنی اس گھٹیا خواہش کو پورا کرنے کے لیے عورت کو ایک ذریعہ بنا لیتا ہے اور اس سے جال بچھانے کا کام لیتا ہے پھر آگے چل کر فاضل مضمون نگار نے موجود ایام کی خوف دلانے والی علامتوں کو ان علامات سے ملانا شروع کیا ہے جو رومن ایمپائر کی جمہوری حکومت میں پیدا ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ لکھتا ہے:

''رومانی جمہوری حکومت کے پچھلے دور میں مدبران سلطنت اور اعیان مملکت نازک مزاج اور عیش پسند عورتوں کی صحبت بہت پسند کرنے لگے تھے اور ایسی عورتیں ان دنوں بکثرت پائی جاتی تھیں۔ پس وہی حالت جو ان دنوں تھی یہاں بھی پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ عورتوں کی طرف نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ عیش پسندی اور آرائش و زیبائش کے پیچھے مٹ جاتی ہیں اور شوق ان کا یہ جنون کے درجہ تک پہنچ گیا ہے۔''

آخر کوئی بتائے کہ رومانی قوم جس کو عظمت و بزرگی کی محبت نے ترقی و تمدن کے اعلیٰ زینہ پر پہنچا دیا ہے۔ اپنے بزرگوں کے کارنامے دل سے بھلا کر تنزل اور ادبار کے تاریک غار میں کیوں گر گئی۔ اسے اتنی ترقی اور عظمت حاصل کر لینے کے بعد تباہی و ذلت کا راستہ اختیار کرتے ہوئے کیوں شرم نہیں آئی؟ یہ تصور کیونکر کیا جا سکتا ہے کہ ایک ایسی قوم جو اپنے عروج و عظمت کے عہد میں عورتوں کو سخت پردہ کی پابند رکھتی تھی۔ آخر اس بات پر راضی ہو گئی کہ اس کی وہی خانہ نشین عورتیں بادشاہوں اور وزیروں کی جس وقت چاہیں ان کے عہدوں سے معزول کرا دیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ حیرت انگیز انقلاب کیونکر ہوا۔ ضروری ہے کہ یہ امر تدریجی رفتار سے ظہور میں آیا ہو۔ بے شک یہ حالت رفتہ رفتہ نشوونما پاتی رہی۔ پہلے اس معاملہ کو کچھ وقعت نہیں دی گئی پھر جب یہ آگ اندر ہی اندر سلگ کر شعلہ زن ہوئی، تو مہلک بیماری یک بارگی جسم و جان کو جلا کر سیاہ بنا گئی۔ انیسویں صدی کے انسائیکلوپیڈیا کا مصنف لکھتا ہے:

''عورتوں میں عیش پسندی اور بناؤ سنگار کی مجنونانہ محبت صرف اس زمانہ میں بڑھی جو رومن حکومت کی شہنشاہی کا دور تھا ورنہ جس وقت رومانی سلطنت ایک جمہوری حکومت تھی ان دنوں

عورت کی زندگی منزلی دائرہ میں ہی محدود تھی اور وہ گھر میں بیٹھی کپاس کا سوت کاتا کرتی تھی مگر روما کے ملک میں آرام پسندی کو رفتہ رفتہ ترقی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ مشہور رومانی فلاسفر کاٹن اپنی قوم کو اس خطرہ سے ڈرانے پر کمر بستہ ہوا جو ایک دن ان پر بربادی لانے والا تھا۔"

اس زمانہ میں کاٹن نے وہی کام کیا جو آج ہمارے ملک میں پردہ نسواں کے طرفدار کر رہے ہیں۔ سچ ہے کہ تاریخ پلٹ پلٹ کر اپنا جلوہ دکھاتی ہے مگر کاٹن کی نصیحت اس وقت مفید نہ پڑی چنانچہ اس کے تھوڑے دن بعد رومانیوں کے امارات کے ٹھاٹھ اور ان کی عشرت پرستی حد سے گزر گئی۔ اس کے بعد مصنف کتاب نے رومانیوں کے لباس کی قسمیں اور عورتوں کے بناؤ سنگار کی وضعوں کا مفصل حال تحریر کیا ہے جس کے بیان کرنے کا کوئی نفع نہیں۔ اس لیے ہم اسے چھوڑ کر یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ کاٹن نے اپنی قوم سے کیا کہا تھا اور ان کو پردہ کی رسم مٹانے کے خطرات سے کس طرح ڈرایا تھا؟ پھر اس کے تمام اقوال کیونکر پورے اور صحیح اترے۔ یہ سب ایسے تاریخی واقعات ہیں جو ہمارے سوا اور قوموں پر گزر چکے ہیں۔ اس لیے ہم پر واجب ہے کہ ان کو بخوبی ذہن نشین کر لیں کیونکہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ اس وقت ہم ایک خطرناک راستے پر چل رہے ہیں۔

انیسویں صدی کے انسائیکلو پیڈیا کا مصنف لکھتا ہے کہ:

جس وقت رومانیوں نے اس قانون کے منسوخ کرانے کے لیے بغاوت اور شورش برپا کی جو عورتوں کے بناؤ سنگار کی حد سے مقرر کرنے کے واسطے پاس ہوا تھا تو روما کا مشہور عالم وحکیم جو دو سو سال قبل مسیح گزرا ہے اپنی قوم کے مجمع میں کھڑا ہو کر ان سے کہنے لگا:

> "روما کے رہنے والو! کیا تم کو یہ وہم پیدا ہو گیا ہے کہ اگر تم عورتوں کو ان بندشوں کے توڑ پھینکنے میں مدد دو گے جو انہیں اس وقت پوری طرح خود مختاری نہیں دیتی ہیں اور جو انہیں مجبوراً اپنے شوہروں کی مطیع بنائے ہوئے ہیں تو ان کی ناز برداری اور ان کا راضی رکھنا ایک آسان کام ہو گا۔ کیا آج باوجود ان بندشوں کے بھی ہم ان سے بمشکل ان فرائض اور واجبات کی پابندی نہیں کرا سکتے جو ان کے ذمے رکھے گئے ہیں۔ کیا تمہارے خیال میں یہ بات نہیں آتی کہ آگے چل کر عورتیں ہماری برابری کا دعویٰ کریں گی اور ہم کو اپنی اطاعت پر مجبور کر لیں گی۔ تم

ہی بتاؤ کہ عورتوں نے جو شورش برپا کی ہے اور جیسا بغاوت انگیز اجتماع کیا ہے وہ اپنے تیئں اس جرم سے بری ثابت کرنے کے لیے کون سی معقول حجت پیش کر سکتی ہیں۔ سنو! ان ہی عورتوں میں سے ایک عورت نے خود مجھ کو یہ جواب دیا تھا کہ ہماری خوشی یہ ہے کہ ہم سر سے پاؤں تک سونے میں لدی ہوئی اور خوشنما قرمزی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تہواروں کے دن اور تمام دوسرے دنوں میں شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر سیر کریں اور خوشنما گاڑیوں پر سوار ہو کر اس منسوخ شدہ قانون پر (جس کا منشا یہ تھا کہ عورتیں بہت آزاد نہ ہوں) اپنی فتح مندی ظاہر کرنے کے لیے سیر کو نکلیں۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ جس طرح تم مردوں کو انتخاب کی آزادی ہو ویسی ہی ہم کو بھی آزادی ہے۔ ہمارے ووٹ لیے جائیں (موجودہ حالت اس وقت سے کس قدر مشابہ ہے) اور ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہمارے اخراجات اور زیب و زینت کے سامان کی کوئی حد مقرر نہ ہو۔"

"رومانیو! تم نے مجھے اکثر مردوں اور عورتوں کی فضول خرچی کا شاکی پایا ہوگا بلکہ میں نے عام لوگوں اور خود قانون دان اور قانون ساز اصحاب کی فضول خرچی کی شکایت بھی کی ہوگی۔ تم نے میری زبان سے اکثر یہ بات سنی ہوگی کہ ہماری جمہوری حکومت دو متناقض بیماریوں میں مبتلا ہے۔ ایک کنجوسی دوسری عیش پسندی۔ یاد رکھو کہ انہیں دونوں بیماریوں نے بڑے بڑے متمدن اور ترقی یافتہ ملکوں کا ستیاناس کر ڈالا ہے اور ڈرو کہ وہی روز بد تم پر بھی آنے والا ہے۔"

اس کے بعد انسائیکلو پیڈیا کے مصنف نے اپنی جانب سے کاٹن کی اس تقریر پر اتنا حاشیہ چڑھایا ہے:

"کاٹن کو اس بارے میں کوئی کامیابی نہ ہوئی اور وہ قانون منسوخ ہونے سے نہ بچ سکا لیکن اس کے ساتھ ہی جن باتوں سے کاٹن نے قوم کو خوف دلایا تھا وہ حرف بحرف پوری اتریں۔"

ہماری موجودہ معاشرت جس سے عورتوں کو حد سے بڑھی ہوئی آزادی نصیب ہے اس کی حالت پر نظر ڈالنے سے دکھائی دیتا ہے کہ عورتوں کی کمینہ خواہش اور ان کا شوق انہیں ہمیشہ اپنی آراستگی اور بناؤ سنگار پر مائل رکھتا ہے یہاں تک کہ جو چیز ان کی خوبصورتی اور خوشنمائی کو بڑھائے

اس کے حاصل کرنے کے لیے ان پر دیوانگی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ یہ سب باتیں اس حالت سے بھی بڑھ کر خطرناک اور خوف دلانے والی ہیں جو ''روما'' کے ملک کی بیان ہوئی ہیں۔ خیر ہم اس کو بھی چھوڑ دیتے ہیں اور اب دکھانا چاہتے ہیں کہ رومانی سلطنت کی بنیاد ہلنے اور اس میں خلل واقع ہونے کے بعد کیا صورت باقی رہی؟ عروج ملک کے زمانہ میں بھی وہاں کی عورتیں برابر سونے میں لدی ہوئی قرمزی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے سڑکوں پر پھرتی اور اعلیٰ درجہ کی گاڑیوں میں بیٹھ کر نکلتی رہیں؟ ہرگز! نہیں بلکہ بجائے اس کے یہ منظر پیش نگاہ آیا کہ رومانی مردوں نے اپنی عورتوں پر گوشت کھانا، ہنسنا بولنا اور بات چیت کرنا بھی حرام قرار دے دیا۔ یہاں تک کہ ان کے منہ پر ''موزسیر'' نامی ایک مستحکم قفل لگا دیا تا کہ بول ہی نہ سکیں۔ یہ حالت صرف عام عورتوں کی نہیں بلکہ رئیس و امیر، کمینے اور شریف، عالم و جاہل سب کی عورتوں پر یہی آفت طاری ہوئی۔ پھر عورت کی اسیری اس سے بھی بڑھی، حتیٰ کہ سترہویں صدی عیسوی کے زمانے میں خاص روما میں اعلیٰ درجہ کے قابل اور فاضل آدمیوں کا ایک جلسہ ہوا جس میں یہ سوال پیش کیا گیا کہ آیا عورت میں بھی جان ہے۔

اگر میں ناظرین سے وہ کیفیتیں بیان کرنا چاہوں جو عورت کے جرائم کی تحقیقات میں ظہور پذیر ہوئی تھیں یا جس طرح کے مختلف آلات ان غریبوں کی ایذا دہی کے واسطے استعمال کیے جاتے تھے تو میرے دل میں نہ اس قدر قوت ہے کہ ان کو بیان کر سکوں اور نہ قلم میں اتنی طاقت ہے کہ وہ لکھ سکے۔ ہاں اگر کوئی مصور اس قدر جرات کرے کہ وہ ان مجرمہ عورتوں کی تصویر کھینچ دے جن کے جسموں پر قطران ٹپکایا جاتا تھا۔ جو گھوڑیوں کے ساتھ باندھ کے گھسیٹی جاتی تھیں اور گھوڑے ہر طرف دوڑتے پھرتے تھے۔ ان بیچاریوں کی ہڈیاں پسلیاں تک چور چور ہو جاتی تھیں جبکہ بہت سی عورتیں ستونوں کے ساتھ باندھ دی جایا کرتی تھیں اور ان کے نیچے آگ روشن کر دی جاتی تھی جس کی سوزش سے ان کا گوشت گل گل کر گر جاتا تھا اور ایسی بری حالت سے ان کی جان نکلتی جس کے خیال کرنے سے کلیجہ تھرا اٹھتا ہے اور دل پھٹنے لگتا ہے ''ریویو آف ریویوز'' کی پندرہویں جلد میں یہ تمام حالات ۵۴۲ مفصل درج ہیں اور ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سنگدل مردوں نے ان عورتوں کو کس طرح سے قید مصیبت میں ڈالا ہے۔

ان انقلابات کو دیکھنے والا مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ حیرت زدہ ہو کر اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ یہی عورتیں ابھی کل کی بات ہے کہ پوری آزادی سے بہرہ ور اور مردوں پر حکمرانی کرتی تھیں۔ آج ان کی یہ حالت کیونکر ہو گئی کہ وہ بے رحمانہ انسانی مظالم کا شکار ہو رہی ہیں۔ مظالم جن کے تصور سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جو حد درجہ کے وحشیانہ ہونے کی حیثیت سے انسانی افعال قیاس نہیں کیے جا سکتے۔ آخر یہ حیرت خیز کایا پلٹ کیونکر ہوئی؟ اور اس تبدیلی کے پیدا ہونے کی وجہ کیا ہے؟ وہ کیا چیز تھی جس نے عورت کی سابقہ آزادی کو نابود کر کے اس کی جگہ اسے اسیری، عبودیت اور اس قسم کے وحشیانہ برتاؤ میں مبتلا کر دیا۔ یہ تمام سوالات تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کے دل میں پیدا ہوں گے اور وہ ان کے جوابات اس وقت تک نہیں پا سکیں گے جب تک علم النفس اور علم العمران کے اصولوں کی چھان بین نہ کریں جو ایک لمبی چوڑی بحث ہے لیکن ہم اس کا ماحصل صرف دو لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

> ”جس وقت رومانیوں کی حکومت و سلطنت خوب عروج پر آ گئی۔ وہ عزت و عظمت کے ساتھ دنیا کی باقی قوموں پر غالب آ گئے اور روئے زمین پر ایسا کوئی شخص نہیں رہ گیا جو ان کے سامنے چوں و چرا کر سکے تو ان کے دلوں میں عیش پسندی اور راحت طلبی کی محبت نے گھر بنایا اور یہ دونوں اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتیں جب تک اس میں مرد اور عورت دونوں جنسوں کا باہمی میل جول نہ ہو۔ اہل روما کی طبیعتوں میں یونان کے بے دینوں اور ان رومانی حکیموں کی تعلیم مؤثر ہو چکی تھی جو یونانیوں کے مقلد تھے۔ اسی لیے انہوں نے اپنی عورتوں کو پردہ سے آزاد کرانا شروع کیا اور یہ حالت بڑھتے بڑھتے اس درجہ تک پہنچ گئی کہ آخر کار سیاسی معاملات میں عورتوں کو غلبہ حاصل ہو گیا۔ مرد اور عورت کے اس آزادانہ میل جول کی وجہ سے روما والوں میں جیسی کمینہ عادتیں اور گندی خصلتیں پیدا ہو گئی تھیں میرا قلم ان کے لکھنے سے شرماتا ہے جن سے ان کی ہمتیں مردہ ہو گئیں اور ارادے پست ہو گئے اور طبیعتوں میں کمینہ پن آ گیا پھر تو ان میں باہمی چشمک اور خونریزی و خانہ جنگی کا زور ہوا اور

یہ فساد اس قدر بڑھا کہ انسانیت اور اخلاق کا ان میں ناطہ تک نہیں رہ گیا۔ اس حالت کے دوران بہت سی نئی باتیں ایسی بھی پیش آئیں جنہوں نے حالات کا رخ پلٹ دیا اور لوگوں کے دلوں میں یہ خیال جما دیا کہ ان تمام خرابیوں کی جڑ محض عورتیں ہیں اس لیے عورتوں سے ناراضگی بڑھنے لگی ان پر دن بدن سختیاں کی جانے لگیں حتیٰ کہ معاملہ بڑھتے بڑھتے اس درجے تک پہنچ گیا جسے میں قرون وسطیٰ سے لے کر سترہویں صدی کے خاتمہ بلکہ اٹھارہویں صدی کے آغاز تک کی حالت دکھاتے ہوئے تحریر کر آیا ہوں اور مجھے نظر آتا ہے کہ مغربی ممالک (یورپ) کے لوگ آج پھر بعینہ وہی حالت از سر نو قائم کرنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ ہر روز عورتوں کو مفتوں بنانے کے لیے نئے نئے اسباب اور خود ان پر فریفتہ ہونے کے تازہ بہ تازہ ڈھنگ ایجاد اختراع کرتے رہتے ہیں اور ان کی پاک دامنی اور طہارت پر حملے کرنے کے واسطے طرح طرح کے وسائل استعمال میں لا کر اس کی تدبیر کر رہے ہیں تاکہ جس مصیبت میں عورتوں کی اگلی بہنیں مبتلا ہو چکی ہیں ویسی ہی آفت میں موجودہ عورتوں کو مبتلا کریں۔ یورپ کے تمام عقلمند اور فلاسفر لوگ اس بات کو بخوبی سمجھ گئے ہیں اور اب یہ بات ان کے نزدیک اتنی واضح ہو گئی ہے کہ انسائیکلوپیڈیا تک میں لکھی گئی ہیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے بہت سے مقاموں پر وہ عبارتیں نقل کی گئی ہیں اور آگے چل کر اس سے بھی زیادہ اہم امور معلوم ہوں گے یعنی بیچاری عورت مرد کے ہاتھوں میں گلبازی کی حیثیت سے زیادہ مرتبہ نہیں رکھتی۔ عجیب بات یہ ہے کہ مرد اپنی دینداری کے زمانہ میں عورت کو پردہ کی قید میں رکھتا ہے پھر جس وقت اس کے دل میں عیش پرستی اور لہو ولعب کی محبت داخل ہوتی ہے تو عورت کو پردہ سے نکال کر اس کی کمزوری سے دل بہلاتا ہے اور انواع واقسام کی زیب و زینت اور بناؤ سنگار کے سامان ایجاد کر کے عورت کو عشرت پسند اور بد اخلاق بنا دینے کے بعد آخر اسے اپنے لیے بار گراں لیے کر دوبارہ پہلے سے بھی زیادہ سخت اور مصیبت ناک قید میں ڈال دیا کرتا ہے تو اس حال میں مسلمان خاتون کا پردہ میں رہنا اس کے لیے اس طرح کی مصیبت

میں مبتلا ہونے سے بچنے کا بہت عمدہ ذریعہ ہے اور اس کے مرتبہ کمال کا محافظ۔ اسلام نے عورت کو اپنے حکیمانہ قوانین کے مضبوط و مستحکم احاطہ میں پناہ دی ہے۔ وہ قوانین جو مسلمانوں کے دل نشیں ہو کر ان کے صفحہ قلب پر نقش فی الحجر ہو رہے ہیں اور جب تک وہ اپنا دین بدل کر کسی اور مذہب کے پابند نہ ہو جائیں، ہرگز اس تعین اور پائیدار چار دیواری کو منہدم نہیں کر سکتے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ مسلمان خاتون چودہ سو سال سے ان تمام انقلابات کی زد سے محفوظ رہتی چلی آئی ہے جو اس کے سوا دنیا کی اور عورتوں پر طاری ہوئے اور جس کا ایک شمہ تم کو دکھایا بھی جا چکا۔ اس لیے تم ہی بتاؤ کہ پردہ سے بڑھ کر اور کون ایسی مبارک نعمت ہے جو عورت کو مرد کے ہاتھوں میں گلبازی یا کھلونا بنانے سے محفوظ رکھ سکے تاکہ عورت مرد کی نفسانی خواہشوں کا شکار اور اس کے اشاروں کا تابع ہونے سے بچ سکے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یورپین عورتیں جس قسم کی سنگدلی اور بے رحمی کا مسلسل کئی صدیوں تک شکار رہیں اس صورتحال سے مسلمان خاتون کو پردہ کے سوا کسی اور چیز نے بچائے رکھا؟ ہرگز نہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ہم ایسی عمدہ نعمت کو ترک کرنے پر آمادہ ہوں۔"

کتاب "المراۃ الجدیدۃ" کے مؤلف فرماتے ہیں کہ:

"یورپ میں اس وقت بہت سی جماعتیں اس قسم کی ہیں جو حکومت سے سخت ترین مطالب بزور منوانے پر آمادہ ہو جاتی ہیں لیکن اسی کے ساتھ ان میں سے کسی جماعت نے آج تک عورتوں کے پردہ میں رکھنے کا مطالبہ نہیں کیا کیونکہ وہاں تو اس کے برعکس حالت ہے کیونکہ مذہبی گروہ باوجود عورتوں کی آزادی اور ان کے حقوق کے جو عورتوں کو مردوں کے ساتھ ہم مرتبہ بنا دے۔ اس بارے میں معتدل المشرب اور متوسط خیال رکھنے والے اشخاص کے ہم آہنگ رہے۔ اس لیے ہمیں سوال کرنے کا حق ہے کہ اتفاق کا راز اور سبب کیا ہے؟"

ہم کہتے ہیں کہ موجودہ زمانہ کے فلسفہ کا مؤسس آگسٹ کونٹ اور تمام فلاسفہ وقت جو فلسفہ حسی کے زبردست عالم اور یورپ کے ان بڑے لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جن کی رائے حقائق اشیاء پر

حکم لگانے کے بارے میں سارے ملک کے نزدیک مسلم ہوتی ہے، ان سب لوگوں کی رائے ہے کہ عورت کو صرف اس نمائشی آزادی کا ضرورت سے زیادہ حصہ ہی نہیں مل گیا ہے بلکہ وہ اپنی طبیعی حدود سے بھی خارج ہوگئی ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کے اقوال پچھلے ابواب میں ہم نقل کر چکے ہیں اور وہ اقوال ہمارے اس دعوے کو بخوبی ثابت کر کے فاضل مؤلف کے قول کی تردید کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اس زمانہ میں نامی گرامی عالموں اور عقلمندوں کے ایسے ہی اقوال موجود ہونے کے علاوہ سب سے زیادہ قابل اعتبار انسائیکلو پیڈیا کا فیصلہ ہے جو علوم عصریہ کا نچوڑ اور عقلائے یورپ کی آراء کا خلاصہ ہے۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا کا مصنف عورتوں کے فتنہ میں پڑنے کی وجہ سے مملکت روما کی تباہی کا حال لکھنے کے بعد نہایت دردانگیز الفاظ میں یہ بھی تحریر کرتا ہے کہ:

''ہماری موجودہ سوسائٹی میں بھی جس میں عورتوں کو حد سے زیادہ آزادی ملی ہے، نظر آرہا ہے کہ عورت کے مذاق کی کمینگی اور اس کی وہ شدید خواہش جو اسے ہمیشہ اپنی آراستگی اور افزائش حسن و جمال کی فکروں میں مصروف رکھتی ہے۔ آخر اس حالت سے بھی کئی درجہ بڑھ کر آفت زدہ اور ہولناک ثابت ہوگی جو ہم سے پہلے روما والوں پر گزر چکی ہے۔ ایک ایشیائی آدمی اس جملہ کو سن کر چونک پڑے گا کیونکہ یہ اس کے وہم وگمان کے بالکل خلاف ہے، مگر وہ بیچارہ معذور رکھنے کے قابل ہے کیونکہ اسے ایک مدت سے یورپ کی مادی مدنیت کی ہر ایک شکل کے ساتھ حسن ظن رکھنے کی عادت پڑ چکی ہے اس کے دل میں یہ وہم سما گیا ہے کہ اس مدنیت کا راز سمجھ لینا ایشیائی لوگوں کے دماغ کا کام نہیں۔ ان کے پست خیالات تمدن یورپ کے بلند کنگروں تک نہیں پہنچ سکتے اور اس لیے ایشیا والوں کو یورپی مدنیت پر نکتہ چینی کرنے کا کوئی حق نہیں۔''

انسائیکلو پیڈیا کا مصنف بہت کچھ حالات بیان کرنے کے بعد پھر لکھتا ہے:

''بے شک کچھ ہم ہی وہ پہلے شخص نہیں ہیں جن کو عورتوں کی زینت پسندی کا روز بروز ہمارے اخلاق پر برا اثر ڈالنا محسوس ہوا ہے بلکہ ہمارے نامور اہل قلم حضرات نے بھی اس موضوع پر خامہ فرسائی میں کمی نہیں کی اور ہمارے بکثرت ناول جو عام پسندیدگی کی نظروں سے دیکھے

گئے ہیں اس خرابی کا موثر پیرایہ میں ذکر کر چکے ہیں جو عورتوں کے جنون تک پہنچے ہوئے بناؤ سنگار کی خواہش سے گھرانوں کی بربادی کا سبب بن جاتی ہے اس لیے ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بیماری سے ہمارا پیچھا کیونکر چھوٹ سکے گا جو ہماری موجودہ مدنیت کی جڑیں کھودے ڈالتی ہے اور اس کو بہت جلد معدوم و برباد کر دینے کی دھمکی دیتی رہتی ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ دو کہ یہ ایک لاعلاج تنزل ہے۔"

پھر اگر یورپ باوجود اپنی قدر شوکت وعظمت قوت وطاقت اور کثرت اسباب ودولت مندی کے اپنے انسائیکلو پیڈیا اور اپنے نامور اہل قلم کی زبان سے عورتوں کی فضول خرچی اور حد سے زیادہ کر آرائش کا ذکر کیا ہے اور اسے تباہی و بربادی کا موجب بنا کر ایسی تہذیب کو باعث زوال قرار دیا ہے تو خیال کرنے کی بات ہے کہ ایشیائی ممالک جو پہلے ہی افلاس وتباہی کے شکار ہیں کرتے ہوئے ہیں، عورتوں کے لیے بناؤ سنگار کا سامان کر کے کس مصیبت میں گرفتار ہوں گے؟ ناظرین! آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں عورتوں کے لیے باعتبار پاک دامن اور عفت پسند رہنے کے پردہ کی ضرورت پر زور نہیں دیتا اور صرف اسی غرض سے ان کو پردہ میں رکھنا نہیں چاہتا بلکہ میرے ایسا کرنے کی وجہ ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ اس طرح عورت کی نازک جنس کے حقوق پامال ہوتے ہیں۔ کون نازک جنس؟ جس کے خیالات اعلیٰ درجہ کے اور جس کے طبعی جوش حد سے بڑھ کر قابل قدر ہیں جو شرم وحیا کی پتلی اور نیکی وطہارت کی دیوی ہے۔ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ اخلاقی قوت اور وہ اخلاقی قوت جو انسان کی سرشت میں داخل ہے مردوں کی نسبت عورتوں میں زیادہ بڑھی ہوئی اور نہایت قیمتی ہے۔ عورتوں کی آبرو مردوں کی آبرو ہے اس واسطے پردہ کو میں ایک مستحکم قلعہ سمجھتا ہوں جس کے اندر پناہ لے کر وہ مردوں کے شرمناک حملوں سے محفوظ رہ سکتی ہے اور اس حملہ آور جنس کی شرارت ان کو ضرر نہیں پہنچا سکتی۔ مردوں کو اس بات پر اعتماد ہوتا ہے کہ ان کی جسمانی ترکیب میں کوئی ایسی بات نہیں پائی جاتی جو ان کو بدچلن ہونے کی حالت میں یقیناً بدنام بھی کر سکے۔ ایک مرد بظاہر نیک بن کر خفیہ طور سے بدچلنی کر سکتا ہے اور اس کا پردہ بھی ڈھکا رہتا ہے، اسی وجہ سے دیکھا جاتا ہے کہ بے باک مرد بڑی بڑی کوششوں اور عجیب ترکیبوں سے عورتوں کو اپنی جانب مائل کر لیتے ہیں۔ حوادث عالم کی چھان بین کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو

بدچلن اور اس کی اخلاقی طہارت کو نجس کرنے والا صرف مرد ہے۔ یہاں تک کہ مصری اخبار ''مقطم'' نے اپنی ۸ فروری ۱۹۰۱ء کی اشاعت میں عمرانی لحاظ سے پردہ کو بری رسم بتاتے ہوئے اس واضح اور عیاں حقیقت کو بھی پیش کیا چنانچہ وہ لکھتا ہے:

''ہر ایک معاشرت اور سوسائٹی کی تاریخ اس بات پر گواہی دیتی ہے کہ عفت و پاک دامنی کی اعلیٰ صفت پر مرد ہی حملہ آور ہوتا ہے اور عورت مدافعت کرتی ہے۔''

لہٰذا اس صورت میں کیا یہ بات قرین انصاف ہوگی کہ ہم کوئی ایسا ذریعہ تلاش کریں جس کی اعانت سے کمزور اور نزاکت مآب عورت کو سنگدل اور بدچلن مرد سے بچا سکیں؟ کیا کوئی ایسا انصاف نہیں کہ ہم عورتوں کو بے حیا مرد کی چالبازیوں کے چنگل سے بچانے کی کچھ تو تدبیر کریں جس وقت ہم عورت کو بدچلن ہونے کے لحاظ سے برا بھلا کہنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں تو یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ وہ کمزور مخلوق مرد کے شیطانی حیلوں اور مکروں کے جال سے کیونکر بچ سکتی تھی جبکہ خونخوار شیر باوجود جنگلوں میں زندگی بسر کرنے اور اژدھے باوجود تاریک غاروں اور عمیق بلوں میں رہنے کے اس کے دام مکر میں پھنس جاتے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ لوگ عورت کو کس طرح کی مخلوق دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیا ان کے خیال میں عورت اپنی نفسانی دبا کر فرشتہ بن جائے، اگر یہ خیال ہے تو نہایت افسوس کا مقام ہے۔ کیا یہ باتیں ہد درجہ کی سنگدلی پر نہیں دلالت کرتیں؟ کیا یہ سخت سے سخت قید نہیں؟ بعض لوگ کہیں گے کہ تم پھر مردوں کو پردہ میں رہنے کا حکم کیوں نہیں دیتے؟ عورتوں ہی پر اس قدر سختی روا رکھنی کہ وہ بیچاریاں گھروں کی چار دیواری میں قید کر دی جائیں کیوں جائز رکھی ہے؟ کیا یہ پردہ کی قید عورتوں کی حق تلفی کیے جانے کی پیش بندی نہیں؟ ہم اس کا یہ جواب دیں گے کہ جب عورتوں کا مردوں سے الگ رکھا جانا ضروری اور لابدی امر ہے اور عورتوں کا وظیفہ طبعی منزلی زندگی تک محدود ہونے سے ان کا گھر سے باہر نکل کر خارجی کاموں میں مشغول ہونا ایک سخت معاشرتی خلل ہے تو اس بات پر لحاظ کرتے ہوئے کہ مرد کی زندگی کا مقصد خارجی دنیا کے جھگڑوں میں پڑنا قرار پایا ہے، ہم کو لازم ہے کہ ان نقصانوں میں جو نقصان کم درجہ کا ہو اسے اختیار کر لیں اور زیادہ مضرت رساں بات کو ترک کر دیں

ورنہ اگر کوئی دانا اور فاضل شخص مردوں کے واسطے کسی ایسی تدبیر کو ایجاد کرے جس پر کار بند رہنے سے وہ عورت پر حملہ آور نہ ہو سکیں تو مجھے امید بلکہ یقین ہے کہ عورت کی نازک جنس کو آفات زمانہ سے محفوظ رکھنے کے لیے مسلمان لوگ اس تدبیر پر سب سے پہلے بہ دل و جان عمل کریں گے۔

اخبار ''المقطم'' لکھتا ہے:

''پاک دامنی کا تحفظ کرنے کے لیے سوسائٹی میں پردہ کوئی اعلیٰ درجہ کی چیز ثابت نہیں ہوئی اور ہمارے اس دعوے کی صحت پر یہ بات شاہد ہے کہ نامی اہل قلم اور مصنفین میں ہم کو ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جو اس بات کا دعویٰ کر سکے کہ شہر کی پردہ نشین لڑکیاں بے پردہ پھرنے والی دیہاتی اور بدوی لڑکیوں کی نسبت زیادہ صاحب عفت اور پاک دامن ہوتی ہیں اور کسان عورت یا بدوی عورت کی آبرو پردہ نشین بی بی کی طرح محفوظ نہیں رہتی۔''

ہم بھی کہتے ہیں کہ اس بات کو ہر شخص صحیح تسلیم کرے گا مگر اسی کے ساتھ ہمیں یہ بات بھی نہ بھولنا چاہیے کہ ایک کسان عورت اور ایک بدوی عورت جو بے پردہ اور بے نقاب رہتی ہیں، وہ کسب معاش کی جنگ میں اور دنیا کے زندہ رکھنے کے جھگڑوں کی ادنیٰ ترین حالت میں ہوتی ہیں اور سائیکولوجی (علم النفس) نے ثابت کر دکھایا ہے کہ جو انسان ایسی حالت میں ہوتا ہے اسے محض اپنی جان اور جسم کو ہلاکت سے بچانے کی فکر رہا کرتی ہے، بنابریں ایسی عورتوں کے پاس کوئی اس قسم کا وقت ہی نہیں بچتا جس میں ان پر کھیل اور تفریح کے خیالات غالب آ کر انہیں ان کے نفسانی جذبات سے اثر پذیر ہونے پر مجبور بنا دیں تم ان کو دیکھو گے کہ وہ اپنے شوہروں یا ماں باپ کے ساتھ سارا دن سخت جسمانی محنت کے کاموں میں بسر کرتی ہیں اور جس وقت رات آ جاتی ہے تو ان کے تھکے ہارے بدن ان کو آرام حاصل کرنے کے خواہاں بنا دیتے ہیں، اس لیے تم دیکھو گے کہ کسان یا بدوی عورت کو جہاں اتنا مال مل گیا جو اسے بسر اوقات کی فکر سے نجات دلا دے تو وہ سب سے پہلے اپنا منہ چھپانے اور مردوں کی نظر سے اوجھل ہو جانے کی تدبیر کرے گی۔ اب رہا ''المقطم'' کا یہ قول کہ جس وقت اخلاقی بندش ٹوٹ جانے کی صورت میں پاک دامنی کے اعلیٰ

جوہر پر حملہ آور ہونے والا عنصر مرد ہی ہوتا ہے اور عورت اس بیش بہا جوہر کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں تو عقل کا مقتضی یہ ہے کہ عورت کی عقلی قوتوں کے ساتھ ہی اس کی اخلاقی قوتوں کو پختہ بنایا جائے، اس کے ادراک اور تجربہ کو وسیع کیا جائے تا کہ وہ اس بات کو بخوبی معلوم کر لے کہ اسے اپنی فضیلت وکمال کے مرتبہ کو کس طرح محفوظ رکھنا چاہیے۔

ہمارے پاس اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح کی تربیت ہر ایک عورت کو حاصل ہونا محال ہے بلکہ اس سے نفع اٹھا سکنا صرف دولت مند اور اہل ثروت لوگوں کی بیٹیوں کا حصہ ہے کیونکہ سالہا سال مدرسوں میں تعلیم پاتے رہنے کا اتنا خرچ پڑتا ہے کہ لڑکی کے برابر سونا تول کر اتنی تربیت دی جاسکتی ہے۔ اس وجہ سے ننانوے فیصدی سے بھی زیادہ لڑکیاں اس قسم کی تعلیم وتربیت سے بہرہ ور نہیں ہوسکتیں اور وہ حملہ آور عنصر (مرد) کے دام فریب میں بآسانی پھنس سکتی ہے، لہٰذا اس خیالی تربیت کی بنیاد پر کوئی عام تمدنی یا معاشرتی قاعدہ کلیہ بنانا درست نہیں ہوسکتا اور اسی کے ساتھ فیشن کے دلدادہ اور مددگار حضرات جس معنوی پردہ کو عورت کے لیے پیش کرتے ہیں۔ وہ نسبت ہلکے مادی پردے کے کئی درجہ بڑھا ہوا سخت اور دشوار ہے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ مرد عورتوں پر کس قدر سختی روا رکھتا ہے۔ ایک طرف تو یہ بات مانی جاتی ہے کہ عورت کی نازک جنس عنصر قوی کے دباؤ میں واقع ہوئی ہے اور اسی کے ساتھ دوسری طرف یہ خواہش بھی کی جاتی ہے اس سے اپنا چہرہ نہ چھپائے بلکہ یہ پردہ جو مرد اور عورت کے مابین ہونا چاہیے، صرف آنکھ کا اور اخلاقی پردہ ہے یعنی اس قسم کا پردہ جیسا فلاسفہ اور حکیم لوگ دنیائے فانی کی محبت کے لیے کافی سمجھتے ہیں اور جوان کے اور ان کی نفسانی خواہشوں کے مابین حائل ہوتا ہے۔ سبحان اللہ گویا ہمارے مہربانوں کا مقصد یہ ہے کہ عورت تو بس ایک فرشتہ ہو جائے، جو باوجود اس کے کہ اس پر ہر طرف سے نفسانی خواہشوں کو بھڑکانے والے احساسات کا دباؤ ڈالا جاتا ہو کبھی بشریت کے پھندے ہی میں نہ پھنسے۔

❊ ❊ ❊

اثر تربیت

کیوں نہ ہمارے یہ مہربان عورت کو اس کا مادی پردہ عطا کر دیں تا کہ خود عورت اور اس کے ساتھ مرد بھی دونوں اس ہولناک کشمکش سے بچ جائیں؟ اور عورت کا وہ وقت خالی چھوڑ دیں جس میں وہ اس رنج والم سے بھری ہوئی زندگی کے میدان میں ظالم مرد کو نیچا دکھانے کی کوشش کرے؟ ہاں اس موقع پر کہا جائے گا کہ تم اس بحث میں اعتدال کی حد سے بڑھ گئے۔ تم نے افراط سے کام لیا اور جو کچھ تم نے ثابت کیا ہے اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ مرد کے لیے بجز اس کے دنیا میں کوئی ضروری کام ہی نہیں رہ گیا کہ وہ عورتوں کو ورغلاتا رہے اور ہر وقت ان کو اپنے دام فریب ہی میں لانے کے درپے ہو جائے حالانکہ تربیت ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو عالی نفسی، بلند حوصلگی اور شرافت و اخلاق کے فاخرہ لباس میں ملبوس بنا دیتی ہے۔

مگر ہم اس کا یہ جواب دیں گے کہ یہ سب باتیں کہنے اور سننے کے لیے ہیں ورنہ ہم کو تو زمین کے کسی خطہ میں ان الفاظ کے مدلولات اور معانی دکھائی نہیں دیتے۔ اگر یہ بات صحیح ہوتی کہ تربیت و تہذیب انسان کی تعدی اور زیادتی کو مٹانے میں مادی سزاؤں کی قائم مقام بن جاتی ہے تو پھر معتدل فرقہ کے تمام نظریات کو بھی صحیح ہونا چاہیے کیونکہ وہ بھی تو یہی کہتے ہیں کہ مروجہ قانون اور قانونی لوگ جن کی تعظیم و عزت کی جاتی ہے اور حکومت جو انسانوں کی مقدار پر ناپ رکھتی ہے اور انہیں اپنے اپنے انداز پر قائم کیا کرتی ہے، یہ سب باتیں محض ایسی رکاوٹیں ہیں جو انسان کو ظاہری اور باطنی کمال کے مدارج پر ترقی کرنے سے باز رکھتی ہیں ورنہ اگر یوں انسان مخلی بالطبع چھوڑ دیا جائے کہ اس کی فطری قوتیں ہی اس پر تاثیر ڈالتی رہیں تو اس میں بذات خود اعلیٰ درجہ کے جذبات نشو و نما پائیں گے اور دنیا میں پھیلے ہوئے طبعی قوائے فانیہ کے اثر سے انسان کے اخلاق خود بخود سدھر جاتے ہیں۔

غیر معتدلوں کا یہ قول ہے کہ یہ قوانین جن کی نسبت کا خیال ہے کہ ان سے ملکوں میں عدل وانصاف قائم ہوتا ہے، انسانوں کے حقوق مساوی کیے جاتے ہیں، ظالموں کو ظلم وزیادتی سے روکا جاتا ہے اور بدچلن لوگوں کو انصاف اور دادخواہی کے دائرہ سے قدم باہر نہیں رکھنے دیا جاتا، ان قوانین کا بجز اس کے اور کوئی اثر نہیں دیکھا جاتا۔ ان سے مجرم لوگوں کی تعداد بڑھتی ہے اور دنیا میں سنگدلی اور بداخلاقی زیادہ پھیلتی جاتی ہے، اس لیے ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر فی الواقع تربیت مادی سزاؤں کی بجائے انسانی عادتوں کو سنوار سکتی ہے تو یہ بھی صحیح ہے کہ کسی نظری قضیہ کی تحقیق کرتے ہوئے خارجی مقدمات سے مدد لینے کی ضرورت نہیں۔ بس اسی قضیہ پر اسناد کر لینا کافی ہے جس کی تحقیق جاری ہو۔

میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ کوئی صاحب مجھے دنیا کی تمام قوموں میں سے ایک قوم بھی ایسی دکھا دیں جس میں محض تربیت کے فیض نے اس سنگدل مرد کو اپنی بہیمی خواہشوں سے روک دیا ہو اور اس کے حیوانی اغراض کو اس سے ترک کرا دیا ہو۔ دنیا کی تاریخ ہمارے پیش نظر ہے اور یہ تمام قومیں اور مذاہب ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں مگر وہ سب اس بات کی دلیل ناطق بن کر شہادت پیش کر رہے ہیں کہ محض تربیت ہی نے ایک دن بھی مرد کو برائیوں میں مبتلا ہونے اور جرائم کا ارتکاب کرنے سے باز نہیں رکھا اور اس کے فولادی دل کو کبھی اس لیے نرم نہیں بنایا کہ وہ کمینہ عادتوں پر عمدہ عادتوں کو ترجیح دے۔ کاش! اگر ہم بھی ان لوگوں میں ہوتے جو خیالی پلاؤ پکا کر اپنا دل بہلا لیتے ہیں تو صرف تربیت کے فوائد پر ہم اس سے کہیں زیادہ حاشیے چڑھا سکتے تھے جتنے اور لوگ چڑھاتے ہیں مگر ہم تو تجربات زندگی کے دائرے سے باہر قدم ہی رکھنا نہیں چاہتے اور جب تک ہم قابل شنوائی بات کہنے کے آرزومند ہیں اور ممکن الحصول ترکیبوں کو بتانا چاہتے ہیں اس وقت تک ہمارا یہی مسلک رہے گا۔

اس مقام پر ہم اس بات کی ایک اور مثال پیش کرتے ہیں جن سے واضح ہو جائے گا کہ انسان کی خواہشوں کو قانونی سزاؤں سے آزاد اور اس کے جذبات کی رو کو قید و بند سے بری کر دیا جائے تو صرف تربیت ہی ہرگز اس کی مطلوبہ درستی حالت کے لیے کافی نہ ہوگی۔ دیکھو متمدن ملکوں میں ایک شخص بچپن سے لے کر جوانی اور بڑھاپے کی عمر تک برابر شراب خواری سے روکا جاتا ہے۔ اخبارات، رسائل، کتابوں اور لیکچروں کی زبانوں سے وہ شراب کی خرابیاں سنتا اور

مطالعہ کیا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس عادت بد کی بھینٹ چڑھنے والے شخصوں کی حالت اپنی آنکھوں سے دیکھ کر محسوس کرتا ہے کہ فقر و فاقہ اور مرض اس کے لوازم ہیں، وہ بخوبی دیکھتا ہے کہ شراب خوری نے اس کے علاوہ دوسرے اشخاص کے اعضائے جسم کو اس طرح بگاڑ دیا ہے کہ جن کے دیکھنے سے عقل چکرا جاتی ہے اور دل لرز جاتا ہے مگر باوجود ان سب باتوں اور اتنی اعلیٰ تربیت حاصل کرنے کے خود وہی شخص مے نوشی پر مٹا ہوا دیکھا جائے گا۔ اس نے شراب خواری پر اپنی زندگی وقف کر دی ہوگی اور روز بروز اس عادت بد میں ترقی و کمال حاصل کر رہا ہوگا اب بتاؤ کہ تربیت نے کیا عمل کیا اور تہذیب نے کونسا اثر دکھایا؟ کیا یہ ایسی محسوس دلیل نہیں ہے جس کو ہر ایک صاحب نظر شخص دیکھ سکتا ہو اور اس سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ حملہ آور عنصر (مرد) صرف تربیت ہی کے وسیلہ سے اپنی حد پر نہیں رک سکتا۔ چاہے وہ کیسی ہی اعلیٰ درجہ کی ہو مگر جہاں تربیت کا تعلق ہے تو اس کے ساتھ جب تک کوئی مادی رکاوٹ بھی شامل نہ کی جائے جو آدمی کو گندی باتوں سے آلودہ ہونے اور کمینہ عادتوں کی پیروی کرنے سے روک دے اور جہاں تک محض شراب کا معاملہ ہے جس کے لیے آدمی کی جسمانی ترکیب میں کوئی مطالبہ کرنے والی قوت بھی نہیں پائی جاتی تو غور کرنا چاہیے کہ پھر مرد کی ان بہیمی خواہشوں کے روک تھام میں خالی تربیت کا کیا خاک اثر ہوگا جو اس کی جسمانی ساخت کے لحاظ سے بھی اسے اپنی راہ چلنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ اس بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان اپنی بیوی کو قیدی بنانے یا اسے حقیر سمجھنے اور اس پر اعتبار نہ کرنے کی نیت سے پردہ میں نہیں بٹھاتا بلکہ وہ اس پر غیرت کھانے اور اسے حملہ آور عنصر (مرد) کے ہاتھوں سے محفوظ رکھنے کی غرض سے ایسا کرتا ہے کیونکہ تاریخ اس بات پر روشنی ڈال رہی ہے کہ عورت کو بہکانا مرد ہی کا کام ہے اور عورت اپنے آپ کو مردانہ وار اس کے حملوں سے محفوظ رکھنے والی ہے۔ مسلمان خاتون کچھ اس لیے پردہ میں نہیں رہتی کہ پردہ اس کے ذلیل، حقیر اور اس کے اخلاق پر اعتبار نہ کیے جانے کی علامت ہے بلکہ ان کا یہ پردہ صاف بتا رہا ہے کہ وہ خاتون نہایت صاحب عزت اور اپنے نفس کی مدافعت میں بمقابلہ حملہ آور عنصر کی دو قوی ہتھیاروں سے کام لینے والی ہے جن میں سے ایک تو ان کے اندرونی اخلاق ہیں اور دوسرا اس کا ظاہری پردہ تاکہ مرد اس کے دامن عفت کو چھو سکنے سے

بالکل مایوس ہو جائے۔ کیا اس قدر علم حاصل کر لینے کے بعد بھی کوئی مرد اپنی عورت کو پردہ توڑنے کی صلاح دے سکتا ہے یا خود وہ عورت اپنی مرضی سے پردہ کو اتار کر الگ رکھ سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔

جس طرح یورپ میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سلطنت وحکومت اور قاعدہ وقانون انسان کی ابتدائی تاریک زندگی کے یادگار اصول ہیں۔ اسی طرح چند اشخاص پردہ کو بھی زمانہ جاہلیت کی باقی ماندہ رسم بتاتے ہیں مگر ہمارا یہ مقصد نہیں کہ معدودے چند لوگوں کی کسی بات کو اچھا یا برا سمجھنے کے لحاظ سے قابل عمل معاشرتی قانون بنائیں یا کوئی اصولی قاعدہ کلیہ قرار دیں کیونکہ دنیا کی قوموں میں آج بھی مختلف خیالات پائے جاتے ہیں۔ کسی کو دانتوں کو سفید چمکیلی رنگت بری معلوم ہوتی ہے اور وہ انہیں سیاہی سے رنگ دیتے ہیں۔ کبھی زیب وزینت کے لیے نیل کا گدنا گدوایا جاتا ہے۔ تو کیا اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ہر جگہ کے رہنے والے ان ہی امور کو پسند کریں؟ بلکہ انسان کے اعمال کو عمدگی اور بہتری کے میزان پر تولنے کے لیے عقل وفطرت کو سب سے بڑھا ہوا پایہ نصیب ہے اور ان کے اعتبار سے جو حکم لگایا جائے وہ درست اتر سکتا ہے، اس لیے ہمیں جب بھی حالات یا انسانیت کے احوال کو جانچنا اور پرکھنا منظور ہو تو اس کے تولنے اور آزمانے کے لیے انہیں دو میزانوں اور معیاروں پر اعتماد رکھنا مناسب ہے اور ہم شروع میں بیان کر آئے ہیں انسان کے حالات ایک ایسے کالج کے مشابہ ہیں جس میں انسان کو ہر ایک مناسب ونامناسب بات کی تعلیم مل سکتی ہے اور اگر بعض آدمی پردہ کو بنظر فطرت دیکھ کر اسے گرفتاری تصور کرتے ہیں تو اسی کے بالمقابل پردہ کو اچھا سمجھنے والے اشخاص فیشن کی پابندی میں بن سنور کر عورتوں کا برانداختہ نقاب پھرنا کہیں زیادہ برا خیال کرتے ہیں۔ یہ واضح ہو جانے کے بعد کہ پردہ عزت اور غیرت مندی کی علامت ہے اور عورت کے استقلال وسعادت کا واحد ضامن وکفیل ہے۔ اب ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ آیا پردہ عورت کے کامل بن سکنے میں مانع ہے یا نہیں؟

٭٭٭

پردہ دار عورتوں کا کمال

ہم مسلمان جن کو:

خذ ما صفا ودع ما کدر:

پر عمل کر کے فائدہ اور حکمت کی بات جہاں سے بھی مل سکے لے لینا چاہیے۔ ہمارا فرض ہے کہ جب تک حرکت انسانی کے مکمل مجموعہ کو نہایت غور اور تحقیق کی نگاہوں سے نہ چھان ڈالیں اور فائدہ کے شگفتہ پھولوں اور نقصانوں کے نوکدار کانٹوں میں امتیاز نہ کر لیں اس وقت تک کسی معاملہ میں ہاتھ نہ ڈالیں تاکہ ہم مضرت رساں پہلوؤں سے بچ کر مفید اور کارآمد چیزوں سے فائدہ اٹھانے کے اہل ثابت ہوں۔ ہمارے پاک خدا نے ہمیں یہ ہدایت کی ہے کہ گزشتہ قوموں کی تاریخ پر غائر نگاہ ڈال کر اس بات کا مطالعہ کریں کہ ان کی بربادی وتباہی کے اسباب کیا ہوئے پھر ان امور سے بچنے کی کوشش کریں تاکہ ان قوموں کی طرح ہم پر بھی آفت اور زوال نہ آئے۔ اس بنیاد پر ہم نے یہاں تمدن یورپ کے روشن اور تاریک پہلوؤں کو پوری طرح دکھایا۔ پھر ان کا گزشتہ اقوام کی حالت سے مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ عورتوں کو مطلق العنان بنا دینے سے علاوہ بھی طرح طرح سے ان پر ناقابل برداشت مصیبتیں نازل ہوں گی۔ مردوں کو بھی ایسی آفت کا سامنا ہوگا کہ وہ موجودہ علمائے یورپ کی طرح چیخ اٹھیں گے اس لیے ہم پر واجب ہے کہ اس راستہ سے جو بربادی کے مہلک غار کی طرف جا رہا ہے الگ ہو کر عورتوں کی اصلاح اور درستی کے لیے کوئی ایسا صاف اور سیدھا راستہ تلاش کریں جس پر چلنے میں ہمیں حکمت الٰہی کے حدود اور احکام فطرت انسانی کے دائرہ سے ذرا بھی قدم باہر نہ رکھنا پڑے۔

افسوس ہے کہ ہمارے ملک کے وہ نوجوان جن کو آزادی مستورات کے خبط نے گھیر رکھا ہے بجائے اس کے کہ یورپ کی نیم آزادی یافتہ عورتوں کی حالت پر غور کر کے اسے ایک سوشل مرض

تصور کریں اوران یورپین علماء کے ہم خیال بنیں جن کی علمیت اور دماغی لیاقت زمانہ میں مسلم ہے پھران ہی یورپین اورامریکن فاضلوں کی طرح اپنے ملک کوخرابی کی اشاعت سے محفوظ رکھنے کی سعی کریں۔ اس لیے وہ ان گمراہ خیال اوراحمق یورپی فرقہ کی پیروی کرتے ہیں جس کوعقلائے یورپ نے خوب آڑے ہاتھوں لیا ہے چنانچہ آگے چل کرہم انہیں فاضل لوگوں کے اقوال سے یہ ثابت کردکھائیں گے۔ کاش! ہمارے وہ قومی نوجوان جواپنی ترقی کاراز یورپ کی اندھی تقلیداور اس کے قدم بقدم چلنے میں مخفی خیال کرتے ہیں، اس خطرناک دروازہ کوکھٹکھٹانے کے بجائے تھوڑی دیر کے لیے ہماری اسلامی زندگی کے سوشل قواعد پرنظرڈالتے توانہیں صاف طور سے معلوم ہوجاتا کہ اسلام کی پاکیزہ روح نے اپنے صحت بخش اثر سے ہمیں ان تمام تمدنی اورعمرانی مرضوں سے محفوظ رکھنے کی قوت عطا کی ہے مگرہم اس سے اسی وقت مستفید ہوسکتے ہیں جبکہ اس کی روح کو اپنے جسم میں داخل کریں۔ جناب قاسم بک اپنی کتاب ''المراۃ الجدید'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''اس لیے ہم یقین کرسکتے ہیں کہ ہمارے ملک میں بھی ہر سال بہ نسبت سال ماسبق کے پیشہ وراور دستکارعورتوں کی تعداد بڑھتی جائے گی کیونکہ اب ہم بھی اس شاہراہ پرچل رہے ہیں جس پرہم سے پہلے یورپ کاقدم زن ہواتھا۔''

ہم فاضل مولف سے اس بارے میں بالکل متفق نہیں ہوسکتے نہ ہم یورپ کے نقش قدم پر چلتے ہیں اور نہ کبھی اس کی خواہش ظاہر کی ہے اگر یونہی اہل یورپ کی اور ہماری معاشرت پرایک سرسری نظر بھی ڈال کر دیکھا جائے تو ہمارے اصول زندگی اوراسباب تمدن میں ان کے اصول زندگی اوراغراض تمدن سے کوئی مناسبت ہی نہ پائی جاتی۔ ہماری قومی بندش کاذریعہ دینی اصول ہیں۔ ہمارے دل میں یہ خیال جما ہوا ہے کہ ہم انہیں سعادت دوجہاں تک پہنچانے والے ان اصول کوترک کرکے تخت عزت سے خاک مذلت پرآگرے ہیں اور یورپ کی قوموں کے افراد ہم جنس اور ہم وطن ہونے کی رسیوں میں باہم بندھے ہیں۔ ان کے تصور میں ان کی موجودہ ترقی کا راز دینی تعلیم سے الگ ہوکرکام کرنا ہے۔ اس لیے ہمارے عام اصول معاشرت پرسرسری نظر کرنا ہی اس بات کو مان لینے کے لیے کافی ہے کہ جب تک ہمارے یہاں بھی دینی رابطہ کی بجائے ملکی

اور ہم جنسی کا رابطہ باعث اتحاد قرار پایا جائے اور جس وقت تک ہمارے ذہن میں یہ بات جم نہ جائے کہ ہم اسی وقت ترقی کر سکتے ہیں جبکہ اپنے دین اسلام سے (معاذ اللہ) دستبردار ہو جائیں اس وقت تک ہم کسی طرح یورپ کی قدم بقدم پیروی نہیں کر سکتے مگر اس موقع پر ہم یہ سوال کریں گے کہ آیا جب تک علم اور تجربہ ہم کو بتاتا ہے کہ ہمارا مذہب ہی ہمارے لیے اکسیر اور ہمارے تمام زخموں کا مرہم ہے اس وقت تک یہ کیسے ممکن ہے کہ مذکورہ بالا مہلک اور برباد کن تغیر ہم میں پیدا ہو سکیں۔ حضرت یہ ہمارا ہی عقیدہ نہیں بلکہ بہت سے یورپین علماء بھی اس مسئلہ میں ہمارے ہم خیال ہیں اور انہیں بخوبی معلوم ہے کہ مسلمانوں کے تنزل کا سب سے بڑا سبب ان کی دینی لاپرواہی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب تک ہمارا اعلیٰ رابطہ دنیا کی اور قوموں سے جداگانہ رہے گا اور انشاء اللہ رہے گا۔ ہم قطعاً کسی دوسری قوم کی ایسی اندھی تقلید نہیں کر سکتے جس سے ہماری طبعی ترکیب کی کایا پلٹ ہو جائے اور جو ہمارے دلوں میں جڑ پکڑے ہوئے طرز تمدن سے مطابق نہ ہو۔ پھر اسی کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ عورتوں کے معاملہ میں یورپ جس راستہ پر چل رہا ہے وہ اسی کے مستند علماء اور عمرانی حضرات کی شہادتوں سے نہایت پرخار اور آفت زار ثابت ہو رہا ہے کیونکہ یورپ کے روشن خیال علماء عورتوں کو مردوں کے کام سنبھالنے کی کوشش میں مصروف پا کر اسے ایک ایسا معاشرتی مرض تصور کرتے ہیں جس کی روک تھام اور جس کا علاج ضروری ہے پھر ہمیں ایسی کیا پڑی ہے کہ خواہ مخواہ ان کی وہ بیماری اپنے گھروں تک لائیں اور انہی آلام کا شکار بن جائیں جن سے آج خود اہل یورپ چیخ رہے ہیں اور اگر ہمیں یورپ کی تقلید ہی کرنا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ان باتوں میں ان کی پیروی نہ کریں جن میں وہ راستی اور درستی کے مسلک پر چل رہے ہیں؟

بہر حال ہم کو اس وقت تک کوئی بات اختیار نہ کرنا چاہیے جب تک ان کا کھرا کھوٹا پرکھ کر اور عقل مصلحت اندیش سے کام لے کر اس کے تمام نشیب و فراز کو نہ سمجھ لیں۔ محض ظاہری چمک دمک پر فریفتہ ہونا دانائی سے بہت دور ہے پھر اگر ہم اپنے آپ میں اتنی ہمت نہ پائیں تو کم از کم جو کتابیں علماء یورپ کی مصنفہ مل سکتی ہیں ان ہی کی ورق گردانی کر کے دیکھیں کہ وہ لوگ اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ چنانچہ انہوں نے جو باتیں مسئلہ نسواں کے متعلق کیں انہیں نوٹ کر کے

سوچ و بچار کرنے کی زحمت گوارا کریں تاکہ ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ اگر ہم اپنی بیماریوں کا علاج خود اپنے ہاتھوں نہیں کر سکتے تو ہماری یہ کوشش بھی کہ اور قوموں کے ہاتھوں سے ان کا معالجہ کرائیں عبث ثابت ہو گی۔

علامہ فوزیہ کے قول کو سنو اور دیکھو کہ باوجود آزادی نسواں کا بہت بڑا حامی ہونے کے اس جنس لطیف کی پریشاں روزگاری پر اشک حسرت بہاتا جاتا ہے اور کہتا ہے:

''آج عورتوں کا حال کیا ہے وہ محرومی اور بے کسی کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ کاروباری دنیا میں بھی ہر طرف مرد ہی کا دور دورہ ہے۔ یہاں تک کہ سلائی اور کشیدہ کاری کے باریک کام بھی مرد کے قابو میں دیکھے جاتے ہیں اور اسی کے مقابلہ میں عورت سخت محنت اور تھکا دینے والی مشقت کے کام میں مصروف پائی جاتی ہے۔ اب بتاؤ کہ مال و دولت سے بے نصیب بنائی گئی عورتوں کی زندگی بسر کرنے کے کون سے ذریعے رہ گئے؟ کیا وہی چرخہ یا حسن و جمال بشرطیکہ وہ ہو بھی؟''

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہم کو اپنی تمام ضروریات زندگی اور اصول معاشرت میں بالکل یورپ کے نقش قدم پر چلنا چاہیے، ان کی رائے میں ہماری ترقی کے لیے یہی صورت کارآمد ہے کہ ہم یورپ کے نقش قدم کا تتبع کریں مگر ہم کہتے ہیں یورپ کا راستہ کچھ اور ہے اور ہمارا طریقہ کچھ اور، اور صاف صاف بات یہ ہے کہ ہمارے اسلامی معاشرت کے اسباب اور زندگی بسر کرنے کے اصول جنہوں نے آج تک ہم کو اقوام عالم کے جسموں میں مل کر اپنی ہستی تباہ کرنے سے محفوظ رکھا اور انشاء اللہ آئندہ بھی اس سے بچائے رکھیں گے۔ وہ ہمیں اس وقت یورپین لوگوں کے مثل بننے کا ہرگز موقع نہ دیں گے جب تک ہم اپنی قومیت کو مٹا کر ان کے موی جسم میں فنا ہو جائیں اور یہ بات محال نظر آتی ہے کیونکہ اسلام کی قوی اور پائیدار روح نے ہمیں اس قدر متانت عطا کی ہے کہ اب کوئی قوم یا ملت ہم کو پیس ڈالنا چاہے تو ہم پس نہیں سکتے بلکہ قبل اس کے کہ کوئی غیر ہم کو پیس ڈالے، خود یہی متانت ہم کو ریزہ ریزہ کر دے گی۔

اس کی مثال یہ ہے کہ ذرا یورپ میں جا کر تعلیم پانے والے ان معدودے چند اشخاص کی حالت پر نظر ڈال کر دیکھو کہ ان کو وہاں کی مادی مدنیت کی نظر فریب نمائش نے کس طرح اپنا مفتوح بنا لیا ہے۔ یورپین طرز معاشرت کا افسون ان کے دلوں پر ایسا چل گیا ہے کہ اب وہ لباس، چال ڈھال، کلام، سلام اور ہر ایک طرز ادا میں یورپ کی تقلید پر مٹے جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کو ایک نظر دیکھ کر ہمیں بتاؤ کہ ان کی کیا حالت ہو گئی ہے؟ اور اب تم انہیں کس جانب منسوب کر سکتے ہو؟ آیا وہ ایشیائی اور ایشیا کے باشندے ہیں؟ کبھی نہیں کیونکہ وہ ایشیا اور ایشیائی باشندوں کو گالیاں دیتے ہیں۔ یہاں کی عادتوں اور رسم و رواج کو برا بتاتے ہیں اور ان کو ایشیائی ممالک میں بجز پستی اور ادبار کے کوئی اور بات نظر ہی نہیں آتی۔ وہ اپنے ملک میں جدھر منہ پھیرتے ہیں ادھر کی حالت دیکھ کر بے ساختہ اف کر دیتے ہیں اور جہاں نظر ڈالتے ہیں وہیں ان پر حسرت چھا جاتی ہے تو پھر کیا وہ یورپی ہو گئے؟ ہرگز نہیں اس لیے کہ ان کی صورتیں ان کے خلاف گواہی دیتی ہیں اور ان کے قابل اعتناء اور جوہری اعمال کھلم کھلا ان کے منافی نظر آتے ہیں۔ گو وہ زبانی جمع خرچ سے اپنے آپ کو تعلیم یافتہ یا ترقی یافتہ بتاتے ہیں لیکن فی الواقع وہ تعلیم پا کر اور کھوئے گئے نہ ان میں جدوجہد کا مادہ ہے نہ ہمت و استقلال ہے اور نہ ان کے پاس کوئی ایسی خوبی ہے جس سے ان کے اہل ملک کو نفع پہنچے؟ یہ کیوں ہوا؟ اس واسطے کہ انہوں نے اہل یورپ کی تقلید کرنی چاہی مگر ان ہی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہو گی ہو کہ خود ان کی طبیعتوں میں ایک ایسی قوی رکاوٹ موجود ہے جو انہیں اہل یورپ میں شامل ہونے سے باز رکھتی ہے تاہم وہ جس راستہ پر قدم رکھ چکے تھے اس سے واپسی اور اپنے دستور پر عمل کرنے کا موقع اس لیے نہیں پا سکتے کہ اہل یورپ کی چند ظاہری اور اوپری تقلیدیں جو انہوں نے اختیار کر لی تھیں اب ان میں بطور ملکہ طبعی کے جم گئی ہیں۔ لہٰذا وہ اہل نظر اور صاحب دل لوگوں کے سامنے بالکل اپنی جگہ پر پس کر رہ گئے ہیں:

گئے دونوں جہاں کے کام سے وہ
نہ ادھر کے ہوئے، نہ ادھر کے ہوئے

لیکن اس کے برعکس بلغاریہ، سروبا اور مانتی نیگوں وغیرہ یورپین خطوں کے نوجوان جو اپنی تعلیمی زندگی پیرس ولندن وغیرہ کی عظیم الشان یونیورسٹیوں میں بسر کرتے ہیں جب اپنے ملک کو واپس آتے ہیں تو ان کی قوم اور ان کے اہل ملک انہیں محل اعتبار اور قابل اعتماد قرار دیتے ہیں اور وہ لوگ عالی حوصلگی اور بڑے بڑے کام انجام دینے کے لحاظ سے اس کے مستحق بھی ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے کہ بوجہ یورپین ہونے کے ان یورپین ملکوں کے اصول زندگانی یکساں ہیں اور ان کے لیے وہی باتیں مفید ہیں جو وہاں سکھائی جاتی ہیں، بخلاف اس کے مصر یا ہندوستان کے نوجوان جو یورپ میں تعلیم حاصل کرنے جائیں وہ ان ملکوں کے مضر اخلاق اور مشرقی اصول معاشرت کے برعکس عادتوں کو اپنا جز و معاشرت بنا کر واپس آتے ہیں اور بجائے اس کے کہ اپنی او رملک کی نگاہوں میں محبوب ہوں ان کے معتمد الیہ بنیں اور انہیں فائدہ پہنچانے کی کوشش کریں۔ الٹا ملکی سوسائٹی پر بارگراں بن جاتے ہیں اور اپنے ہم وطنوں کو حقیر و قابل نفرت سمجھتے ہیں۔

اب پھر ہم مسئلہ نسواں کی بحث پر واپس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس حالت میں ایک مسلمان اپنی بیوی اور لڑکی کو معمولی برادری کی تقریبوں میں بھی گھر سے باہر جانے کی ممانعت کرتا ہے (حالانکہ یہ پردہ کی حد سے بڑھی ہوئی سختی ہے) اور جہاں تک ہو سکتا ہے پردہ کی سخت تاکید رکھتا ہے تو یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو ایسی تعلیم دے جو اسے کسی دکان پر مال بیچنے اور کسی کارخانہ میں کام کرنے کے قابل بنائے جبکہ مسلمانوں میں اپنی عورتوں کو غیر مردوں کی آواز سننے یا اسے اپنی آواز سنانے سے روکا جاتا ہے تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کو عام اخلاقی یا معاشرتی یا سیاسی جلسوں میں لیکچر دینے کی قابلیت پیدا کرنے کی ترغیب دے؟ جہاں صدہا نامحرم اس کی گفتگو سنیں گے اور اس کو دیکھ سکیں گے۔ ایک صدی کے قریب زمانہ ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کو یورپین اقوام سے میل جول کا اتفاق ہوا اور یوں تو صدہا سال سے غیر قوموں کے ساتھ ان کا رہنا سہنا چلا آتا ہے لیکن آج تک بجز اس کے کہ ان میں پردہ کی قید بڑھتی ہی گئی ہو کبھی اس کے توڑ دینے کا بھی خیال نہ آیا تاہم جب یہ حکم لگا دیا جائے کہ ہماری ترقی کا انحصار

صرف عورت کی آزادی پر ہے اور ہم بغیر اس کے ترقی کر ہی نہیں سکتے تو یاد رکھو ہم اس ترقی کے بلند زینے پر پہنچنے سے پہلے مٹ جائیں گے اور کبھی مسلمان نہ رہیں گے اور خدا وہ دن نہ دکھائے جبکہ ہم اسلام کے دائرہ سے باہر ہو جائیں۔

پھر بھی ناامید نہ ہونا چاہیے کیونکہ اگر ہم لوگ اس بات کو متفقہ طور پر مان لیں کہ عورتوں کا مردوں کے کاروبار میں مصروف ہونا ایک سخت اجتماعی مرض ہے جو قوموں کی زندگی کا خاتمہ کر دیا کرتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہم بجائے اس کو پھیلانے اور بڑھانے کی جدوجہد کرنے کے مسلمانوں کی اس کراہت سے فائدہ نہ اٹھائیں جو وہ اس کے بارے میں رکھتے ہیں جبکہ ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ قوموں کی بربادی اور تباہی قوانین فطرت کے خلاف ورزی کا نتیجہ ہے تو عورتوں کی مردوں کے کاروبار میں شرکت بھی بہرحال قوانین فطرت پے سرکشی ماننی چاہیے۔ جس پر تمام دنیا کے دانشمندوں کا اتفاق ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ ہم کو ناموس ترقی ہر شے کو آئندہ زمانے میں پھر طبعی وضع پر لے آئے گا مگر کب؟ جبکہ وہ اپنی مخالفت کرانے والوں کو سخت سزائیں دے چکے گا:

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِيْلًا (۶۲:۳۳)

٭٭٭
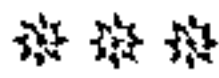
پردہ عورت کے کمال کا مانع ہے؟

انسان اپنی زندگی کے ہرایک دور میں ایسا ہی پایا جاتا ہے کہ اگر وہ کسی چیز کو پسند کر لے تو اس کی خوبی ثبت کرنے کے لیے ہزاروں دلیلیں پیش کر دینا اس کا ادنیٰ کرشمہ ہے اور کوئی امر اسے ناپسند ہو تو اس کی قباحت ظاہر کرنے پر بھی ساری دنیا کے دلائل جمع کر دیتا ہے۔ اس لیے اگر دنیا کے حالات اور اس کے اختلافات حقیقی امور کے شاہد عادل نہ ہوتے تو اس میں شک نہیں تھا کہ اس عالم میں کوئی انسان حقائق کے کمال تک کبھی نہ پہنچ سکتا بلکہ مغالطات کے چکر ہی میں پھنسا رہتا:

وَ كَانَ الْإِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (۱۸:۵۴)

انسان بڑا جھگڑالو ہے۔

کتاب "المراۃ الجدیدہ" کے مولف فرماتے ہیں:

"پردہ کا یہ نقصان ہے کہ وہ عورت کو اس کی فطری حریت سے محروم بنا دیتا ہے اس کو اپنی تربیت کامل کر سکنے سے روکتا ہے بوقت ضرورت اسے اپنی روزی خود کمانے سے باز رکھتا ہے اور بیوی اور شوہر دونوں کو عقلی اور اخلاقی زندگی کا مزہ نہیں چکھنے دیتا اور پردہ کی پابند رہنے کی حالت میں ایسی قابل مائیں پیدا نہیں ہو سکتیں جو اپنی اولاد کی اعلیٰ تربیت پر قادر ہوں اور اسی پردہ کی وجہ سے قوم کی حالت اس انسان کے مانند ہو جاتی ہے جس کے بدن کا ایک حصہ جھولا مار گیا ہو۔"

اب ہم کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک حسی براہین کی بنیاد پر پردہ میں حسب ذیل فوائد ہیں۔
پردہ عورت کو حقیقی حریت سے دور رکھتا ہے بات تم کو معلوم ہو چکی ہے کہ عورت کی اصلی حریت کیا ہے؟ پردہ عورت کو موقع دیتا ہے کہ وہ اپنے نفس کی تربیت مکمل کر سکے، کونسی تربیت؟ جو ایک ماں کو ملنی چاہیے، پردہ عورت کو مردوں کے ساتھ ان کے کاموں میں شریک ہونے سے روکتا ہے، کیسی

شرکت؟ جس نے اس مادی مدنیت کی ہڈی تک نرم کر دی ہے جس پر اس مدنیت کے دونوں براعظم یورپ اور امریکہ کے نامور علماء شہادت دے رہے ہیں اور وہاں کے رہنے والوں اور وہاں کی حکومتوں پر زور ڈالتے ہیں کہ وہ مناسب طریقوں سے عورت کو زندگی بسر کرنے کی ضمانت کا انتظام کریں۔ پردہ بیوی اور شوہر دونوں کو زن وشوئی کی زندگی سے لطف اٹھانے کا موقع دیتا ہے۔ پردہ ہی کے ذریعہ سے ایسی مائیں پیدا ہو سکتی ہیں جو اپنی اولاد کو اسلامی اصول پر تربیت دینے کے قابل اور اس پر بخوبی قادر ہوں اور پردہ ہی کے سبب سے قوم کی حالت اس صحیح البدن انسان کے ساتھ مشابہ ہوتی ہے جس کے ظاہری قوی اعضاء کے علاوہ چند دوسرے طاقتور باطنی اعضا بھی ہوں۔

ہم بھی نہایت سہولت کے ساتھ کہہ سکتے تھے کہ مرد کے لیے اس سے بہتر حالت کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے پہلو میں ایسا ساتھی ہو جو رات دن، سفر، حضر، تندرستی، بیماری اور رنج وراحت غرض ہر ایک حال میں اس کی مونس وغمگسار ہو۔ وہ عقل وادب کی پتلی ہو۔ اپنے شوہر کی تمام ضرورتوں سے واقف، اس کی پوری مزاج دان، اس کے گھر کی منتظم، اس کی صحت کی محافظ، اس کی غربت کا خیال رکھنے والی، اس کے کاموں کو جاری کرنے والی، اسے اس کے فرائض وحقوق سے مطلع کرنے والی اور اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین رکھنے والی ہو کہ اگر وہ اپنے شوہر کے فائدہ رسانی کی کوشش کرے گی تو دراصل یہ خود اپنے ہی فائدہ کی بات ہے اور اسی کے لیے شور اور واویلا مفید ہے:

> کیا وہ مرد بھی خوش نصیب شمار ہو سکتا ہے جس کے پہلو میں ایسی آرام جان بیوی نہ ہو جس نے اپنی زندگی شوہر کی زندگی کے لیے وقف کر دی ہو وہ صداقت کی دیوی اور مال کی مجسم تصویر ہو تا کہ شوہر اس پر دل جان نثار کرے۔ ہر وقت اس کی خوشنودی کا طالب رہے، مقاصد زندگی کے افضل ترین کاموں میں اس مونس وہمراز کی مدد حاصل کرے اور اس سے بہتر سے بہتر اخلاق وادب کا سبق سیکھے۔ ایسی ہی ہم دم جو اس کے گھر کی رونق اور اس کے دل کی مسرت، اس کے اوقات فراغت کے لیے مشغلہ، دلچسپی اور اس کے رنج والم کو دور کرنے کے لیے شگفتہ پھولوں کی طرح کار آمد ہو۔

کیا ہم کہتے ہیں کہ ہمیں ایسی دلفریب باتیں نہیں آتیں۔ آتی ہیں اور ضرور آتی ہیں بلکہ ہم اس سے بھی بہتر اور اعلیٰ عبارت میں رنگین اور دلنشیں جملے لکھ سکتے ہیں مگر بات یہ ہے کہ ہم علم او رتحقیق کے مقام پر کھڑے ہیں۔ تمنا و آرزو کے سبز باغ کی سیر نہیں کرتے۔ دنیا میں ایسا کوئی مرد نہیں ملے گا جس کے نکتہ خیال میں دل خوش کن آرزوئیں بلکہ اس سے بڑھ چڑھ کر امیدیں نہ آتی ہوں لیکن خارج میں ان کا ایک فی صدی حصہ بھی پورا ہوا نہیں پاتا جس کی علت یہ ہے کہ کاروبار عالم کی کنجیاں انسان کے ہاتھوں میں نہیں دی گئی ہیں ورنہ اگر ہر ایک متمنی اپنی تمام آرزوئیں پوری طرح حاصل کرسکتا ہے تو آج دنیا میں کوئی صاحب حسرت اور بدنصیب شخص تلاش کرنے پر بھی نہ ملتا، کاش! شخصی احوال کی اصلاح ایسی ہی سخن پروری سے ہوسکتی تو فاضل اہل قلم کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا آسانی ہوسکتی تھی۔ مثلاً ہم یوں کہہ سکتے تھے انسان کو اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے کہ وہ ایک سرسبز اور خوشنما باغ کے وسط میں فلک فرسا شاہانہ محل کے اندر رہتا ہو، اس کے سامنے خدمت گاروں اور نوکروں کی جماعت اشاروں پر کام کرنے کے لیے استادہ رہتی ہو جو اپنے آقا کے دل پر رنج و فکر کی کدورت نہ آنے دیں اور خود وہ شخص ان بلند حوصلہ اور عالی ہمت و روشن خیال لوگوں میں سے ہو جو اپنی سوسائٹی اور قوم کی بہتر سے بہتر خدمتیں انجام دے کر اپنا نام تاریخ کے صفحوں پر آب زر سے لکھے جانے کے لیے چھوڑ جاتے ہیں جو زمانے میں ضرب المثل بنتے ہیں اور بعد میں دوسرے کام کرنے والوں کو ان کی نظیر دے کر سعی و ہمت کرنے کا حوصلہ دلایا جاتا ہے پھر اس شخص کی اولاد بھی ہو جنہیں وہ اپنے شریفانہ خیالات کی افتاد پر تربیت و تعلیم دے کر ان کو بھی اپنی ہی ایسی پاکیزہ زندگی اور عالی مرتبہ مقام حاصل کرنے کے لائق بنائے اور خدا نے اس کو تمام باتوں میں اعتدال پسندی کی شریف عادت عطا کی ہو جس کے سبب سے وہ اس اعلیٰ درجہ کی نعمت و عظمت سے پاک نفس اور خداترس لوگوں کی ایسی زندگی بسر کرلے جس سے خود وہ، اس کی اولاد اور گھر والے بیماریوں اور پریشانیوں کی زد سے بچتے رہیں پھر تو وہ خوش نصیبوں کی طرح زندگی بسر کر کے شہیدوں کی سی موت پائے گا۔

کیا اس میں شک ہے کہ ہر ایک انسان دل خوش کن امیدوں کو پوری دلچسپی سے دیکھے گا؟ ضرور دیکھے گا بلکہ چاہے گا کہ میں اس عبادت میں اور بھی اضافہ کرتا کیونکہ یہ باتیں اس کی دلی خواہشوں سے بالکل مطابق ہیں مگر ذرا خدالگتی کہہ کر مجھے یہ تو بتاؤ کہ اس دنیائے فانی میں کتنے آدمیوں نے ایسی سعید زندگی حاصل کی ہے اور کتنے آدمیوں کی نسبت یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ اس حالت کو حاصل کرتے کرتے رہ گئے؟

نامور علماء اور فلاسفر بہت کچھ غور و تامل کے بعد دو بڑی قسموں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ ایک قسم کے فلاسفر دعویٰ کرتے ہیں کہ اس دنیا میں خوشی اور آرام کا مطلقاً نام ہی ہے ورنہ زندگی سرتاسر مصیبتوں، رنج و الم، پریشانیوں اور ہر طرح کی آفت سے بھری ہے اس لیے وہ لوگ مایوس ہو جانے والوں کی طرح اس سے اپنا پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسری قسم کے فلاسفروں کی یہ رائے ہے کہ دنیاوی زندگی میں خوبیاں ہیں اور خرابیاں بھی اور خوش نصیب وہ شخص ہے جو اس قانونی زندگی کی خوبیوں سے بقدر امکان نفع اٹھانے کا طریقہ معلوم کرے اور سمجھ جائے کہ اس کی برائیوں سے کس طرح دور رہ سکتے ہیں۔ ایسا شخص زندگی بھر اس دنیاوی سمندر میں آخری عمر تک موجوں کے تھپیڑے کھاتا رہتا ہے۔ کبھی اسے رنج و الم کی گراں بار موج اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور گاہے مسرت کا کوئی ہلکا سا چھینٹا اس پر آ پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے بنیادی وجود کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور وہ اس دوسرے عالم میں جا پہنچتا ہے جہاں اسے اپنی زندگی کے جہاد کے نتائج کا انتظار ہوتا ہے پھر اسے ابدی راحت نصیب ہوتی ہے یا دوامی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اور ان دونوں مذہبوں میں پہلی شق کی طرف تو ہمیں بالطبع کوئی میلان نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی تعلیمات بدیہی امور کے منافی ہیں۔ رہی دوسری شق وہ قابل غور اور دنیا کی زندگی کے لیے قابل عمل طریقہ بتانے کے لیے لائق سزاوار ہے مگر اس ناتواں انسان پر جو بعض اوقات آرام و راحت اور آفت و مصیبت کے وجود میں امتیاز نہیں کر سکتا۔ اس کی زندگی کی تکلیفیں اتنی شاق اور سخت ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ کبھی سعادت کو چھوڑ کر شقاوت کی طرف جانے کی کوشش کرتا ہے مگر اس طرح وہ ایک ایسی مشکل میں پھنس جاتا ہے جس سے وہ بخیال خود دور رہنے کی کوشش کرتا

تھا اور اب اسی میں مبتلا ہو گیا ہے۔

اس دنیاوی ہستی میں کوئی ایسی خوبی نہیں جس کے ساتھ کچھ شر نہ ملا ہو:

ہر جا کہ گل است خار است

و ہر جا کہ نور است نار است

اس لیے جو شخص اس کی بہتری اور خوبی کو ہر طرح کے شرور فساد سے پاک بنانے کی قوت رکھتا ہو، اس میں شک نہیں کہ وہی خوش نصیبوں کی سی زندگی بسر کرے گا اور اصحاب صفہ کا مرتبہ حاصل کرے گا لیکن یہ بات حاصل ہو تو کیونکر؟ انسان اپنی جملہ ضروریات زندگی کے بارے میں مستقل بالذات نہیں اور نہ بلا امداد غیرے ان سب کو پورا کر سکتا ہے۔ انسان ہر ایک کام میں اس کے ساتھ شریک ہیں۔ ان کی طرف سے ایسی رکاوٹیں اور دقتیں پیش آنا شروع ہوتی ہیں کہ ایک دقت کو دور بھی کیا جائے تو اس کے فوراً بعد دوسری مشکل آگے آ جاتی ہے اور اسی طرح یہ انسان کی فانی ہستی حصول مطلوب کی امید بندھنے سے قبل تمام ہوتی ہے۔ بہت سے آدمی ایک چیز کو ہر طرح مفید جانتے ہیں مگر اس کے ساتھ باوجود اس کی خواہش رکھنے کے اس سے دور بھاگتے ہیں۔ آخر یہ کیا بات ہے ان کو اتنی قدرت ہے کہ کوشش کریں تو وہ بات حاصل کر لیں لیکن سوسائٹی اور قومی معاشرت یا خاندانی حالت انہیں اس کا موقع نہیں دیتی کہ اپنی آرزو پوری کر سکیں۔ یہ تمام باتیں انسان کے دل پر ایسی کدورت اور پراگندگی طاری کرتی ہیں جن سے وہ سخت تکلیف دہ فکروں کے بارے میں دب کر رہ جاتا ہے اور اسے کچھ سوجھ نہیں پڑتا کہ کیا کرے لیکن اگر اسی کے ساتھ وہ دل کو مضبوط کر کے اپنے نفس کی طرف رجوع کرے اور ہوش ٹھکانے کر کے اس ذات بابرکات کی طرف متوجہ ہو جس کے قبضہ قدرت میں تمام آسمانوں اور زمین کی باگیں ہیں پھر اس سے اطمینان قلب کی دعا مانگے تو اسے پوری طرح اعتقاد ہو سکتا ہے کہ پاک خدا نے جتنی چیزیں بنائی ہیں سب پوری کاریگری کے ساتھ اور اس کی کوئی مخلوق کسی خوبی سے خالی نہیں اور لامحالہ یہ اس کا حکم ہے کہ خیر و شر اس عالم ارضی کے لوازم میں ہیں جس کی حکمت بالغہ اور مقصد عظیم کو ہم نہیں سمجھ سکتے:

وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً وَ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ (۳۵:۲۱)

اور ہم تو نیکی و بدی میں آزمانے کے لیے فتنہ میں مبتلا کر دیتے ہیں اور تم ہماری ہی جانب

واپس آؤ گے۔

اس لیے جو شخص ان باد مخالف اور متعاکس ہواؤں کے جھونکوں میں اپنی جگہ پر قائم اور اعتدال کا پابند رہے اس کو ابدی بہتری نصیب ہو سکتی ہے ورنہ جو شخص دائیں بائیں جھکا اور ناممکن الحصول آرزوؤں کے درپے ہوا تو اس کا حساب خدا کی جناب میں ہوگا۔

انسان کو صرف یہی بات کافی نہیں ہوتی کہ اس کی بیوی نیک نیت ہونے کے ساتھ بے پردہ، بے نقاب اس کے پہلو بہ پہلو سیر و تفریح بھی کرتی پھرے بلکہ اس کی تو یہ آرزو ہوتی ہے کہ میری حالت اس سے بڑھ چڑھ کر ہو۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے کوئی تکلیف چھو بھی نہ جائے۔ موت نہ آئے۔ تنگ دستی اور بیماری کا اسے نام بھی معلوم نہ ہو اور اس کی تمنا ہوتی ہے کہ اپنے اہل ملک اور ہم جنسوں سب کو یکساں مسرت و شادمانی کی حالت میں دیکھے مگر افسوس یہ تمام باتیں خیالی پلاؤ پکانے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں، انسان کو تکلیف پہنچنی بھی ضروری ہے۔ موت سے اس کو مفر نہیں ملتا۔ تنگ دستی بھی اسے ستائے گی اور خلاف طبیعت امور سے بھی سابقہ پڑے گا اور انسان کے لیے یہ بھی لابدی امر ہے کہ اس کی آزادی و خود مختاری پر روک ٹوک کر کے اسے حریت کی لذت سے بے بہرہ بنایا جائے تاکہ وہ بہت سی ایسی آفتوں سے بچ سکے جو بغیر اس صورت کے اور کسی سے دور نہیں رہ سکتیں۔

میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ پردہ میں ایک طرح کی خرابی بھی ہے لیکن اسی کے ساتھ میرا یہ بھی خیال ہے کہ پردہ گو بذات ایک مصیبت ہے مگر ایک بہت بڑی مصیبت سے بچانے والا بھی ہے اور بدیں لحاظ اس کو اچھا بھی سمجھنا چاہیے لہٰذا ہم انسانوں پر واجب ہے کہ ہر ایک بات میں اپنی دلی خواہشوں کی متابعت پر کمر نہ باندھ لیں کیونکہ بہت سی چیزیں جن کو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں ہمیں نہیں ملتی اور جو چیزیں ہم کو حاصل ہوتی ہیں ان میں بعض ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جن کے دستیاب ہونے کا ہمیں شان و گمان بھی نہ تھا بلکہ اگر وہ چیزیں آرزو کرنے سے قبل ہم پر پوری طرح ظاہر ہو جاتیں تو ہم ان سے منزلوں دور بھاگنے کی سعی کرتے۔

جو لوگ مسئلہ نسواں پر گفتگو کرتے ہیں ان میں سے اکثر لوگوں کو میں یہ خیال کرتے دیکھتا ہوں کہ کامل مردوں کے مابین ایک ایسی کاملہ نقص و عیب سے بری عورت ہے جس میں ہر طرح کی

خوبیاں اور قابل تعریف باتیں جمع ہیں اور وہ مطلقاً شائبہ نقائص سے مبرا ہونے کی وجہ سے بے حد دلفریب خیالی نمونہ ہوتی ہیں۔ گویا وہ عورت حسن صورت اور خوبی سیرت میں کامل اپنے شوہروں کی آنکھ کی پتلی، اپنے گھرانے اور کنبہ کے دل کی ٹھنڈک، اعلیٰ تربیت یافتہ، اپنے وظیفہ طبعی کے فرائض سے واقف اور گھر کے کاموں کو پوری طرح انجام دینے والی ہے۔ پھر اس کے بعد وہ اپنے بیش بہا وقت کا معتدبہ حصہ خارجی معاملات اور قومی اصلاحات کے متعلق علماء کی علمی بحثوں، فلاسفہ کے اخلاقی مذاکروں اور سیاحوں کی جغرافی تحقیقوں میں شریک ہونے پر بھی خرچ کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ اس عورت میں داخلی اور خارجی خوبیاں موجود ہوں۔ ہم بھی مانتے ہیں کہ اگر یہ امید کافی الواقع پورا ہونا ممکن ہوتا تو بہت اچھی بات تھی لیکن قوانین حیات کی ایک رفتار ایسی ہے جو ہمارے گمان میں نہیں آسکتی اور معاملات دنیا کے چند ایسے دور میں جو عقلمند سے عقلمند انسان کے تصور میں بھی نہیں آتے، اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ فاضل اہل قلم کی بہت سی تحریریں بالکل بے اثر رہتی ہیں، جس وقت ہم سوسائٹی کے حالات میں سے کسی حال پر گفتگو چھیڑیں تو پہلے ہم پر واجب ہے کہ جس عالم میں ہم رہتے ہیں اس کی ماہیت کو اپنے خیال میں جمالیں پھر دیکھیں کہ اس میں کس قدر نقصان ہے اور کتنا کمال؟ اور نیز ان دونوں باتوں کا انسانی حالات واطوار سے کیا تعلق ہے تاکہ ہم حکم لگانے میں غلطی سے بچ سکیں اور ہماری نصیحتیں ناممکن الحصول خیالات سے خالی ہوں۔ مثلاً جس وقت مسئلہ نسواں پر گفتگو چھیڑنے پر آمادہ ہوں تو سب سے پہلے ہمیں اس بات پر نظر ثانی کرنی چاہیے کہ ہم عورت کی بابت کچھ کہنا چاہتے ہیں، جو مرد کے مقابل اور ایسی قوم میں موجود ہے جس کے تمام افراد ایسے ہیں جن میں فساد شرارت، ہوا وہوس اور نقص موجود ہیں اور ہم اس عالم ارضی میں ہیں جو برائیوں اور مصیبتوں سے مبرا نہیں بے شک اگر یہ باتیں پہلے ہی ہمارے ذہن نشین ہو جائیں گی تو ہمارا بے جا جوش وخروش ٹھنڈا پڑ جائے گا اور ہم اپنی عقل اور تصور کو قابو میں رکھ کر ایسی باتیں تحریر کریں گے جو قانون کے وجود سے الگ اور فطرت انسانی کے خلاف نہ ہوں گی اور ہمارے اس کلام کا کچھ اثر ہوگا جو ہماری محنت کو ٹھکانے لگائے گا۔

لوگ کہتے ہیں کہ پردہ کے تین سخت نقصانات ہیں جو عورت پر بے حد برا اثر ڈالتے ہیں۔

۱۔ پردہ عورت کی صحت کو کمزور کر کے اسے بیماریوں کا شکار بنا دیتا ہے جس سے اس کے اعصاب ضعیف ہو جاتے ہیں اور پٹھوں کی کمزوری اخلاقی قوتوں میں خلل پڑنے کا موجب ہوتی ہے۔ چنانچہ اس قاعدہ کی بنیاد پر ان کا یہ قول ہے کہ پردہ نشین عورت اپنی نفسانی خواہشوں کی قید میں گرفتار رہتی ہے کیونکہ اعصاب کی صحت اور درستی انسان کو اپنے جذبات نفسانی پر قابو رکھنے میں بڑی مدد دیتی ہے اور ان کی کمزوری ہی اس بات کا بڑا سبب ہے کہ انسان اپنی خواہشوں کو روک نہ سکے اور اسیر ہوا و حرص بن جائے۔

۲۔ پردہ کی وجہ سے شادی کا خواہاں مرد اپنی آئندہ بیوی کو دیکھ نہیں سکتا اور یہی بات کثرت طلاق اور عورت مرد کی باہمی ناچاقی کا بڑا باعث ہے۔

۳۔ پردہ ہی عورت کو تہذیب و علم حاصل کرنے سے روکتا ہے اور اسے حسب خواہش مدرسوں اور بورڈنگ ہاؤسوں میں رہ کر اپنی عقلی اور اخلاقی قوتوں کو بڑھانے سے باز رکھتا ہے۔

اب ہم تینوں شبہوں کی تردید کرتے ہیں کہ پردہ نشین عورتیں نہ مریض ہیں نہ ضعیف الاعصاب بلکہ وہ بحیثیت مجموعی بے نقاب پھرنے والی عورتوں سے کہیں بڑھ کر تندرست اور قوی ہیں اور یہ ایک ایسا قضیہ ہے جس پر ہر ایک ایشیائی سرسری نظر ہی کے بعد صداقت کا حکم لگائے گا۔ تیرہ سو برس گزر گئے کہ مسلمان عورتیں پردہ میں رہتی ہیں۔ اگر پردہ عورتوں میں کوئی کمزوری پیدا کرتا تو ضروری تھا کہ یہ کمزوری ان میں نسلاً بعد نسل بطور وراثت زیادہ ہو جاتی اور آج مسلمان عورتوں میں کمزوری و ناتوانی کی زندہ مثالیں پائی جاتی ہوتیں کیونکہ علم ''بیالوجی'' کے قواعد صاف یہی حکم دیتے ہیں مگر یہاں ہم معاملہ اس کے برعکس پاتے ہیں۔ دیکھا جاتا ہے کہ پردہ نشین عورتوں کی اولاد زیادہ قوی الجسہ ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی محکمہ تندرستی وحفظان صحت کے اعداد و شمار کی رپورٹیں قطعاً اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ایسی عورتوں کے فوت ہونے کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ اگر پردہ صحت کے لیے مضر ہوتا تو عورتوں کا بکثرت مرنا ضروری تھا اور ان میں فوت ہونے

کی تعداد طبعاً مردوں کی نسبت بڑھی ہوئی ہونی چاہیے تھی اور یہ بات مشاہدہ کے خلاف ہے۔ اب رہا آزادی نسواں کے حامیوں کا یہ قول کہ:

پردہ نشین عورتیں اپنی نفسانی خواہشوں کی لونڈی بنی رہتی ہیں۔

عجب بے جوڑ بات ہے عملی سایکالوجی کے قواعد پر اس دعویٰ کا ذرا بھی انطباق نہیں ہوسکتا۔ ہر ایک شخص جانتا ہے کہ انسان میں نفسانی خواہشوں کا اسی وقت زیادہ زور ہوگا جبکہ وہ ان خواہشوں کو ابھارنے والے اسباب میں گھرا ہوا ہو اور ہوا وہوس کا جوش اس وقت عقل کو زیادہ مغلوب بنا سکتا ہے جس وقت کہ انسان کو اپنا مطلوب بآسانی میسر آسکے۔ اس لحاظ سے ہم تم سوال کرتے ہیں کہ انصاف وعقل کے حدود سے قدم نہ نکال کر ہمیں بتادو کہ نفسانی جذبات کو اشتعال دینے والے سامان کس عورت کے لیے زیادہ بہم پہنچ سکتے ہیں پردہ نشین کے واسطے یا کھلے بندوں پھرنے والی عورتوں کے لیے؟ کیا جو عورت پشت در پشت سے میراث میں چلی آنے والی اپنی غیرت کی وجہ سے غیر مردوں کی ہم نشینی سے دور بھاگتی ہے اس پر شہوت انگیز ذرائع کا اثر پڑے گا یا اس عورت پر جو بے دھڑک نامحرم مردوں میں ملی جلی رہتی ہیں؟ اور علاوہ بریں علم سایکالوجی بھی ہمارے لیے اس بات کی سب سے بڑی شہادت بہم پہنچا رہا ہے کہ ہمارا دعویٰ صحیح ہے پھر بھی ہم اس دلیل کو ایک طرف رکھ کر ایک دوسری دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ انسان کو اپنی دلی آرزوئیں برلانے میں سہولت ہوتو اس بات کا اس پر برا اثر پڑتا ہے یعنی اس کی شرم وحیا اور غیرت وخودداری کا پردہ چاک ہوجاتا ہے، اسے اپنی طبیعت پر قابو نہیں رہتا اور وہ ضرور ہوا وہوس کی گندگی میں آلودہ ہوجاتا ہے۔ اس کی مثال کے لیے یوں سمجھو کہ دو ہم عمر، ہم جماعت نوجوان جنہوں نے ایک ہی مدرسہ میں تعلیم پائی ہے اور ایک ہی مربی کی زیرنگرانی رہے ہیں ایسے ہیں کہ ان میں سے ایک اپنے خاندان سے دور پڑا ہے اور بجز اپنی ذاتی تہذیب ومتانت اور بدنامی سے خوف رکھنے کے کوئی ایسی رکاوٹ اس کے سامنے موجود نہیں جو اسے اپنی دلی امنگیں پوری کرنے سے روک سکے اور دوسرا نوجوان اپنے کنبہ والوں میں محصور اور ہر طرف سے نگرانی میں پھنسا ہوا ہے اس لیے اس کے اور اس کی نفسانی خواہشوں کے مابین بہت سی اس طرح کی رکاوٹیں حائل ہیں۔ اگر وہ ایک رکاوٹ کو دور کرتا ہے تو

دوسری اس کی جگہ سامنے آ جاتی ہے پھر اس صورت میں دونوں نوجوانوں میں سے کس کو اپنی امنگیں پوری کرنے کا زائد میلان ہوگا اور کس کا دل قابو سے باہر ہو جائے گا؟ بدیہی طور پر اور بلاتردد کہا جا سکتا ہے کہ پہلا نوجوان ہی اس تیر بلا کا نشانہ بنے گا۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس کی تندرستی اور اس کے مجموعہ عصبی کا نظام اس میں شباب کی ترنگ اٹھنے سے روک دے گا؟ کبھی نہیں بلکہ یہ حالت تو اور بھی اس کے جوش میں اضافہ کرے گی اور اسے ہر ایک وسیلہ سے اپنی خواہش پوری کرنے پر آمادہ بنائے گی اور یہ بات روزمرہ کے تجربات اور مشاہدوں سے بخوبی ثابت ہو رہی ہے کیونکہ یہ بات صحیح نہ ہوتی تو لازم آتا کہ ہر ایک تندرست آدمی کا دل بھی برائیوں سے پاک ہو جو ایک خلاف امر ہے۔ اس لیے کہ تمام بدچلن اور فاسق و فاجر لوگ بہ اغلب وجوہ دوسرے آدمیوں سے نسبتاً قوی اور زور آور ہوتے ہیں۔ اس مقام پر شاید کوئی صاحب یہ کہہ اٹھے کہ بدچلن اشخاص کو تہذیب و انسانیت سے کیا تعلق؟ اگر ان میں جسمانی صحت کے ساتھ عقل و تہذیب کی صحت بھی جمع ہوتی تو ان کی یہی تہذیب انہیں ہر ایک اخلاقی برائی سے پوری طرح روک دیتی۔ یہ بات ہر روز آنکھوں سے دیکھی جاتی ہے کہ اکثر رند مشرب اور عیش پسند وہی لوگ ہوتے ہیں جو تہذیب کے زیور سے آراستہ اور روشن دماغ تصور کیے جاتے ہیں بلکہ ایسے لوگوں میں زیادہ تعداد ان اصحاب کی ہے جو یورپ کے تعلیم یافتہ ہیں لیکن باوجود مغربی تہذیب سے بہرہ ور ہونے کے اوروں کی نسبت وہ کہیں زیادہ اپنی خواہشوں کے بندے ہیں۔ جو تربیت انسان کو خلاف ادب و انسانیت کام کرنے سے روکتی ہے، وہ صرف چند افراد میں پائی جاتی ہے جن کو فلاسفر اور حکماء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے حاصل ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ مدت ہائے مدید تک حقائق اشیاء پر غور کر کے اپنے دل و دماغ کو صحیفہ کائنات کے مطالعہ میں مشغول رکھیں اور جب دماغ میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جائے کہ وہ خلاف تہذیب امور کو قبول ہی نہ کرے تب کہیں جا کر کامل کہلائیں گے۔ اب تمام قوموں کی ہستی پر نظر کی جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ایسے روشن خیال لوگ ان میں معدودے چند سے زائد نہ ہوں گے ورنہ سواد اعظم اور بہت بڑا حصہ اس تہذیب و متانت سے بالکل خالی اور لباس اصلاح سے عاری ہوگا۔ یہاں تک کہ آئندہ زمانہ میں بھی ایسی حالت پیدا

ہونے کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔ میرا یہ قول روزمرہ پیش آنے والے واقعات کو اپنا شاہد بناتا ہے اور ہر ایک دانا و بینا آدمی بآسانی اس بات کا ثبوت حاصل کرسکتا ہے۔

جب یہ بات قرار پاچکی تو اب ظاہر ہے کہ ایک محفوظ اور پردہ نشین عورت نفسانی خواہشوں کی طرف کم مائل ہوگی اور اس کے دماغ میں ایسے خیالات شاذ و نادر ہی گزریں گے۔ بخلاف اس کے کھلے بندوں پھرنے والی عورتوں میں یقیناً اس طرح کی خواہشوں کا زور زیادہ ہوگا جو مانی ہوئی بات ہے۔

ضعف اعصاب اور قوت عقلیہ کی کمی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس معاملہ میں بھی مغربی ممالک کی عورتوں کا نمبر ایشیائی ملکوں کی عورتوں سے بڑھا ہوا ہے۔ عصبی کمزوری محض پردہ نشینی اور گھروں کی چار دیواریوں میں محفوظ ہوکر بیٹھنے سے نہیں ہوتی بلکہ اس کے اسباب بکثرت ہیں جن میں سے چند امور شدت رنج والم، تنگ دستی، فاقہ مستی، عشق و محبت وغیرہ وغیرہ ہیں۔ جو شخص کسی طبی مجموعہ کو اٹھا کر ذرا غور کی نگاہ سے دیکھے گا اس پر واضح ہوجائے گا کہ یہ باتیں یورپین عورتوں کے واسطے ایک معمولی بات بن گئی ہیں۔ اس کے علاوہ کسی قوم میں ضعف اعصاب کی علت ہونے کی اور بھی بے حد نشانیاں ہیں جن میں سب سے اہم علامت خودکشی کی کثرت ہے۔

اسباب جرائم کی تحقیق و تفتیش کرنے والے علماء ''بومبروزد'' وغیرہ نے ثابت کیا ہے کہ انسان قوت عقلی کے صحیح ہونے کی حالت میں قتل و خودکشی کے جرم کا ہرگز مرتکب نہیں ہوتا اور چونکہ قوت عقلیہ کی درستی صحت اعصاب کی تابع ہے اس لیے کثرت خودکشی اس بات کی ایک عملی علامت بن کر ہم کو صاف صاف بتا رہی ہے کہ کس دنیا کی عورتیں سب سے زیادہ ضعیف الاعصاب ہیں۔

ریویو آف ریویوز جلد ۱۱ میں ایطالیا کی سرکاری رپورٹوں سے واضح کیا گیا ہے کہ وہاں سے سن ۱۸۸۹ء سے سن ۱۸۹۳ء تک پانچ سال کی مدت میں ۵۸۶۹ عورتیں خودکشی کرکے مریں۔ اب ان اعداد کو پیش نظر رکھ کر ہمیں کوئی بتائے کہ ہمارے ایشیائی ممالک میں کس قدر عورتیں خودکشی کی مرتکب ہوئیں؟ اور پھر اس خودکشی کو محنت، تنگ دستی اور اس کے علاوہ جس سبب کے ساتھ چاہے منسوب کیا جائے لیکن وہ بہرحال بزدلی اور ضعف اعصاب ہی کا نتیجہ ٹھہرتی ہے۔ اس لیے مشرقی

ملکوں کی عورتیں یورپین ممالک کی عورتوں سے کئی درجے بڑھ کر قوی الاعصاب اور اپنے نفسانی جذبات کے دبا لینے کی بہت زیادہ قوت رکھنے والی ہیں۔

اور جبکہ انسان کا نفسانی خواہشوں پر مائل اور ضبط نفس پر نہ قادر ہونا براہ راست ضعف اعصاب ہی کا نتیجہ ہے تو اس لحاظ سے مشرقی ممالک کے لوگ مغربی ملکوں کے باشندوں سے قوت اعصاب میں بڑھے ہوئے نکلیں گے، کیونکہ اہل یورپ باوجود اس کے کہ ان کے تمام طبقات میں تہذیب پھیل گئی ہے، اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ نشہ آور چیزوں کا استعمال مضرت رساں اور قاتل امر ہے، وہ آج تک اس عادت کو بالکل ترک نہ کر سکے حالانکہ روزمرہ اس عادت بد کی وجہ سے جانی، مالی اور عقلی نقصانات بھی اٹھاتے رہتے ہیں اور اسی پر دوسری نفسانی خواہشوں کا اندازہ لگالو کہ یورپین ملکوں میں اس کا زور مشرقی دنیا سے کئی درجہ بڑھا ہوا پایا جاتا ہے۔

دوسرا نقصان پردہ میں یہ بتایا گیا تھا کہ وہ مرد کو اس عورت کی صورت دیکھنے کا موقع نہیں دیتا جو آئندہ اس کی شریک زندگی اور ہم دم بنے گی اور اسی امر پر وہ زوجین کی باہمی ناچاقیوں اور کثرت طلاق کی بنیاد رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عورتوں کو جس قدر شکایتیں مردوں کی طرف سے پیدا ہوتی ہیں ان کی جڑ یہی اصولی خرابی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ اعتراض بالکل غلط ہے کیونکہ کثرت طلاق یا مردوں کے ظلم وتشدد وتعدی کرنے کی شکایت کچھ مسلمانوں ہی کے دائرے میں مخصوص نہیں بلکہ متمدن ملکوں میں بھی اس کا شور وشر ہمارے یہاں سے بہت زیادہ ہے۔ مہربانی فرما کر ناظرین ہماری اس کتاب کے اس فصل پر نظر ڈالیں جس کا عنوان ہے ''کیا وہی پوری عورت ہے جو مادی تمدن کی پابند ہو؟'' تو حقیقت حال سے خود واقفیت ہو جائے گی۔

اب رہا تیسرا اعتراض کہ پردہ عورتوں کو تہذیب حاصل کرنے اور علم کی تحصیل سے باز رکھتا ہے۔ یہ بھی محض لغو اور بے معنی ہے کیونکہ ایک لڑکی سات سال کی عمر سے لے کر بارہ سال کی عمر تک برابر مدرسہ میں رہ سکتی ہے اور پانچ سال کے عرصہ میں اپنی عقل کو بہت اعلیٰ درجہ کی تہذیب وسلیقہ کے زیور سے آراستہ بنا سکتی ہے۔ قومی خیر خواہوں اور عالی ریفارمروں کے لیے یہ کوئی ناممکن

بات نہیں کہ وہ تعلیم نسواں کے اعلیٰ مدارس اور کالج قائم کر دیں جن میں تمام تعلیم و تربیت دینے والی عورتیں ہی عورتیں ہوں اور ایسے مدارس میں لڑکیاں بے نقاب رہ سکتی ہیں۔ وہاں جاتے ہوئے یا مدرسہ سے نکل کر گھر آتے ہوئے وہ راستہ میں اپنا چہرہ نقاب سے چھپا لیں گی۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ ایسی لائق معلّمہ عورتیں کہاں سے نصیب ہو سکتی ہیں تو یہ خواہ مخواہ کی سخن سازی ہے جس کو ہم کبھی صحیح مان ہی نہیں سکتے کیونکہ:

بہر کاری کہ ہمت بستہ گردد
اگر خاری بود گلدستہ گردد

ہمت شرط ہے اور کام کرنے کے لیے گزراسی توجہ میں سب کچھ ہو جاتا ہے اسی کے ساتھ کیا ضرورت ہے کہ ہم ہر ایک کام ایک ہی وقت میں کرنے پر آمادہ ہو کر طلب لکل فوت الکل کا مصدق بن جائیں کیونکہ ابتداء میں کسی کام کو تھوڑا تھوڑا اٹھا کر بتدریج کمال کے اوج پر پہنچایا جا سکتا ہے۔

ان تمام مراتب کے بعد اب ہم کہتے ہیں کہ پردہ نہ مضر صحت ہے، نہ اعصاب کو کمزور کرنے والا، نہ اس سے نفسانی خواہشوں کا جوش بڑھتا ہے اور نہ وہ بداخلاقیوں کی جڑ ہے بلکہ بنظر انصاف دیکھا جائے تو پردہ بہت سی خراب باتوں اور قابل شرم و نفرت امور کے سامنے ایک مادی رکاوٹ بنا ہوا ہے اور اگر اسی پر کسی اخلاقی رکاوٹ کا اور بھی اضافہ کر دیا جائے تو نور علی نور ہو کر ان تمام خرابیوں اور برائیوں کو مٹا ڈالے جو موجودہ مدنیت کے جسم پر کاری زخم نظر آتے ہیں۔

✻✻✻

پردہ مٹ جائے گا

پردہ کا نابود ہو جانا اور ہمارا ان تمام آفتوں میں پھنسنا جنہیں ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں ناممکن امر نہیں کیونکہ اس مادی مدنیت نے اپنی جھوٹی چمک دمک اور دلفریب زیبائش و رونق کے ذریعہ پہلے بھی بہت سے پردوں اور رکاوٹوں کا قلع قمع کر دیا ہے اور آج تمام اہل مشرق اس بات کو سمجھ چکے ہیں کہ ان زائل شدہ رکاوٹوں کی بہت بڑی تعداد جو شخصی آزادی کے نام سے نابود ہو گئی۔ دراصل وہ کمال بشری کے لوازم میں سے ایک لازمہ اور ضروری شے تھی۔ مگر یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کیونکہ موجودہ مدنیت اس اگلی قید و بند اور گراں بار رسوم و رواج کی زنجیروں میں جکڑے ہونے کا نتیجہ ہے جس نے دنیا کو کئی صدیوں تک نہایت شدید مشکلوں اور تباہیوں میں پھنسا رکھا ہے۔ چنانچہ جب لوگوں کو اس ناگوار حالت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے بغیر اس کے کہ افراط و تفریط کے پہلوؤں کو سمجھ کر اعتدال و میانہ روی کا راستہ تلاش کریں جس چیز میں ذرا بھی بندش اور قید کا نام تک پایا اس سے دور بھاگنے کی کوشش شروع کر دی اور تمام بندشوں کو توڑ پھینکا۔ موجودہ مدنیت کے ہر ایک طور طریقے میں ذرا سا غور و تامل بھی کیا جائے تو یہ حالت صاف صاف عیاں ہو جاتی ہے۔ ہم ذیل میں ان کے چند شواہد بھی درج کرتے ہیں:

دینی پیشواؤں نے ایک زمانہ میں اپنا رسوخ و اقتدار اس لیے بڑھا لیا اور لوگوں کو اپنے جا و بے جا کام کی قیدوں میں اس طرح جکڑ لیا کہ وہ ان کے چنگل سے کسی طرح نکل ہی نہیں سکتے تھے مگر مدنیت کا دور دورہ شروع ہوتے ہی اس نے دینی پیشواؤں کے ساتھ یہ نہیں کیا کہ ان کو حد اعتدال پر لاتی بلکہ بجائے اس کے ان دینی مقتداؤں اور دین و مذہب سب کو ایک لاٹھی سے ہانک کر بالکل نیست و نابود کر دینے کی سعی کی جس کی خبریں ہم کو ہر روز ملتی رہتی ہیں۔

جولوگ انسانوں کی عقلی قوتوں کے سرچشمہ پر قابض تھے انہوں نے اس قدر تنگ دلی اختیار کرلی کہ عام آدمیوں کواپنی دماغی ترقی اور عقلی قوتوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہی نہیں دیتے تھے مگر مدنیت کی رو آئی تو اس نے صرف یہی نہیں کیا کہ لوگوں کو میانہ روی کے مرکز پر ٹھہرا دے بلکہ اس نے ہر ایک اچھے اور برے انسان کے لیے آزاد خیالی مباح کردی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نافہم اور احمق لوگ بھی ان باتوں پر رائے زنی کرنے کے لیے تیار ہو گئے جن کے سمجھنے کی ان میں قوت نہ تھی اور جو ان کی عقل کی رسائی سے باہر تھیں۔قدرت الٰہی کا انکار اور خیالی عقائد کو نہ ماننا ایک عام بات بن گئی ہے جس سے دنیا میں طرح طرح کی خرابیاں آج پیدا ہورہی ہیں۔

تاریخ کے بعض ادوار میں حکام اور فرماں رواؤں نے عقل وفہم کے دائرہ سے نکل کر ظلم وستم کے احاطہ میں قدم رکھا اور خدا کی آزاد مخلوق کو اپنا غلام زرخرید بلکہ اس سے بھی بدتر تصور کرلیا تھا۔تمدن کا دور آیا تو اس نے ان حکمرانوں کی تعدی روکنے اور انہیں ان کی حد پر واپس لانے کی ضرورت ہی پر قناعت نہیں کی بلکہ حکومت کا نام تک مٹا دینے پر کمر باندھ لی اور اس کے قابو سے آزاد ہونے کے لیے وحشیانہ حالت کی تقلید شروع کردی۔چنانچہ نہلسٹ وانارکسٹ وغیرہ مفسد اور خونخوار فرقے پیدا ہو گئے جن کی حالت محتاج بیان نہیں۔

اخلاقی معلموں اور مرشدوں نے خلاف ادب کاموں کے روکنے میں اتنی سنگین قیدیں لگا دی تھیں جن کی وجہ سے لوگ دنیاوی کاروبار سے متنفر اور اس فانی زندگی میں زہد برتنے کے عادی ہو چکے تھے۔مدنیت نے اس شق میں بھی اعتدال کا پہلو نہیں اختیار کیا اور لوگوں کو شخصی حریت کے نام سے اجازت عام کے تاریک غار میں دھکیل دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج مدنیت کا نام لے کر ایسے جرائم کا ارتکاب ہورہا ہے۔جن کے تصور سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور بے زبان جانور بھی ان امور سے احتراز کرنا اولیٰ سمجھیں۔عورتوں پر سختی کرنا ایک زمانہ میں اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ ان کے منہ پر آہنی قفل لگائے جاتے تھے۔گوشت خوری اور ہنسنا تک ان کے لیے حرام قرار دے دیا گیا اور اس جنس کو بے روح سمجھا گیا۔مدنیت کی روشنی پھیلتے ہی عورتوں کو حقوق عطا کیے جانے پر توجہ ہوئی مگر کیونکر؟ اعتدال کے ساتھ؟ نہیں بلکہ اس قدر آزادی اور مطلق العنانی

دی گئی جس کی وجہ سے آج وہی عورتیں شادی بیاہ کی رسم مٹانے پر زور دیتے ہوئے بڑی بڑی کتابیں تصنیف اور شائع کرتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ ان کو اپنی نفسانی خواہشیں پوری کرنے کے لیے بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے تا کہ جس طرح اور جس انداز سے وہ چاہیں زندگی بسر کریں۔ غرض یہ کہ اس عجیب وغریب مدنیت کی یہ حالتیں ہر غور کرنے والے شخص کو صاف طور سے نظر آتی ہیں اور ہم اہل مشرق ہر ایک معاملہ میں بغیر جانے بوجھے اپنے لیے اسی مدنیت کی پیروی ضروری تصور کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اوقات جن باتوں کو ہم اپنے حق میں یقینی طور سے مضرت رساں جانتے ہیں ان کی پیروی سے بھی باز نہیں آتے حالانکہ وہ تقلید ہماری اجتماعی قوت کو منتشر اور ہمیں سرے سے برباد کر ڈالنے والی ہوتی ہے۔ بہر حال جب تک ہمارا یہ طرز عمل قائم ہے اور جس وقت ہم میں ایسے شیروں اور عالی حوصلہ افراد نہیں پیدا ہوتے جو اس مادی مدنیت کی نمائش پر فریفتہ نہ ہو کر اپنے نیک و بد کا خیال رکھ سکیں۔ اس وقت تک ہمیں کوئی اچھا نتیجہ حاصل کرنے کی توقع رکھنا:

دماغ بیہدہ پخت و خیال باطل بست

کا مصداق ہوگا۔

جس طرح اب اکثر نوجوان بلکہ بوڑھوں کے چہروں سے بھی آداب وکمال کا پردہ اتر گیا ہے، اسی طرح یہ کوئی محال امر نہیں کہ مسلمان خواتین بھی پردہ سے باہر نکل کھڑی ہوں مگر ہم تو یہی دعا کریں گے کہ خدا ایسا دن نہ دکھائے۔ بڑے بوڑھے بزرگوں سے سنا جاتا ہے کہ ان کے زمانہ شباب میں یعنی آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے جوان عمر کے لڑکے اور معزز لوگوں کے لیے قہوہ خانوں میں بیٹھنا اور تمباکو کشی کرنا معیوب اور خیال کیا جاتا تھا بلکہ اوسط درجہ کے خوش باش لوگ بھی ان امور سے پرہیز رکھتے تھے لیکن آج ہماری آنکھیں یہ تماشہ دیکھتی ہیں کہ تمدن کی سب سے زیادہ حسین اور خوشنما شکل یہ ہے کہ وہ بالکل آزادی واستغناء کی شان سے عام سڑکوں پر گزرتے ہوئے رہگزروں کے سامنے نظارہ گل رخاں میں مصروف ہوتے ہیں یا کوئی بدچلن شخص شہر کے شارع عام پر فاحشہ اور بازاری عورت کے ساتھ گاڑی میں سوار چلا جاتا ہے مگر ایسے لوگوں کو ان کی خواہشوں سے روکنے کی ذرا بھی کوشش نہیں ہوسکتی۔

یہ سب خرابیاں کیوں پیدا ہوئیں؟ اس لیے کہ مدنیت کی روشنی میں خیالات کی تاریکی دفع

ہونے کے ساتھ ہی شرم ولحاظ کا پردہ بھی چاک ہوگیا ہے اور شخصی آزادی نے کسی قانون وادب کو ملحوظ رکھنا غیر ضروری بنا دیا لیکن باوجود اس کے کہ یورپ کی مدنیت ہمارے ملک کی اخلاقی اور معاشرتی بربادی کا سبب بن رہی ہے اور ہم کو اس سے کس طرح کا مادی نفع نہیں پہنچتا ہے۔ ہم اس کی پیروی پر مٹے جاتے ہیں اور اسے اپنے حق میں آیہ رحمت تصور کیے بیٹھے ہیں۔ یہ حالت دیکھتے ہوئے کچھ تعجب نہیں ہوسکتا کہ شیطان ہمارے کان بھردے اور ہم دور رفتہ کے مبارک اور پر عافیت رسم کو چھوڑ کر اپنی سوسائٹی پر حد درجہ کی آفت نازل کرلیں۔ خدا محفوظ رکھے اس وقت وہ تمام امراض جن کو ہم اس کتاب میں بہ تفصیل لکھ آئے ہیں۔ ہمارے جسم کو لاحق ہو جائیں گے اور ہماری موجودہ بیماریوں پر اس نئے مرض کا اضافہ ہونے سے قومی جسم ایسا سراپا آزار بن جائے گا جس کی خطرناک حالت بیان کرنے کی ہمیں کسی طرح جرات ہی نہیں ہوتی۔

خدا کا شکر ہے کہ اس نے مسلمان کو مایوس ہونے والا انسان نہیں بنایا ہے یہ ایک ایسی شریف عادت ہے جو اسلام کی قومی روح نے اس کی سرشت میں داخل کر دی ہے جس وجہ سے ایک خاص قسم کی اخلاقی جرات اور غیرت مسلمانوں کے دلوں میں سمائی ہوئی ہے اور یہ امران کا امتیازی شان بن گیا ہے۔ اس لیے مجھ کو توقع ہے کہ یورپین مدنیت کا بلاخیز سیلاب ہماری طبیعتوں میں جن نئی بدعتوں کا مسکن بناتا ہے، ایک نہ ایک دن ضروری ہے کہ ان کی کشمکش سے ہماری وہ غیرت مندی جوش میں آئے گی اور ہم کو پھر اس اوج کمال کی طرف لے چلے گی جس کے سایہ رحمت نے ہمارے آبائے کرام اور سلف صالحین کو اپنے دامن عاطفت میں پناہ دے کر مصدر برکات بنا دیا تھا اور ہم اس مستعار بوسیدہ لباس کو اتار کر اور نفسانی خواہشات کی ترغیب اختیار کی ہوئی بدعتوں پر لات مار کر اپنے اس کمال فطرت انسانی کی طرف دوڑیں گے جس کا مقتضی عورتوں کے بارے میں سراسر عدل اور میانہ روی کی شاہراہ پر چلتا ہے نیز جس طرح ہم وہ پہلی قوم تھے جس نے دنیا کو راہ راست کے نشان دکھائے اسی طرح ہم وہ آخری قوم ثابت ہوں گے جس نے کمال انسانی کی محافظت اور بچاؤ میں مردانہ ہمت سے کام لیا ہو۔

❋❋❋

وہی پوری عورت ہے جو مادی تمدن کی پابند ہو

جتنی باتیں ہم اوپر بیان کر آئے ہیں ان پر ایک معمولی نظر ڈالنے کے بعد ہر شخص بخوبی معلوم کر لے گا کہ خود اس مادی مدنیت کے سربرآوردہ اشخاص اب تک اپنے یہاں کسی کاملہ عورت کے نہ پائے جانے کا صاف صاف اقرار کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ جن معاشرتی حالات کے گرداب میں اب وہ گرفتار ہیں ان کی وجہ سے عورت کبھی بھی منتظرہ کمال کے درجہ پر نہیں پہنچ سکتی، بڑی خرابی یہ پیدا ہوگئی ہے کہ عورت نے اپنے قدرتی فرائض کو چھوڑ کر ایک ایسا جداگانہ طریقہ اختیار کر لیا ہے جو پاکیزہ زندگی کے مطالب اور اسرار کائنات کے بالکل منافی ہے۔اس میں شک نہیں کہ اگر ہم بھی ان لوگوں کی طرح ہوتے جو نمائشوں پر مفتون ہو جایا کرتے ہیں اور اصل حقیقت کے انکشاف کی پروا نہیں کرتے تو لازم تھا کہ ہم سب سے پہلے مسلمان خاتون کے لیے یورپین عورت کے قدم بقدم پیروی کرنے کا حکم دیتے لیکن ہم نے اس موضوع پر ایک حرف تک لکھنے سے قبل علم اور فطرت کی نگاہوں سے مسئلہ کی حقیقی واقعیت پر غور کر کے دیکھ لیا تھا کہ انسانی زندگی میں عورت کے لیے ایک خاص شان اس شان کے علاوہ بھی ہے جو اسے سردست حاصل ہے پھر ہم نے یہ دیکھا کہ مسئلہ نسواں کے بارے میں تمدن یورپ کے بانی مبانی اصحاب نے کیا کچھ لکھا ہے تو ہمیں معلوم ہوا ہے کہ وہ بھی ہمارے ہی ہم نوا ہیں اور اس عظیم الشان حقیقت کے بالاعلان تسلیم کرنے والے ہیں اور اپنی پوری طاقت اس بات پر صرف کر رہے ہیں کہ جس طرح ممکن ہو بتدریج ان تمام بیماریوں کو مٹا دو، جو عورتوں کے قدرتی فرائض کے بخوبی ادا کرنے میں حارج و مانع بن رہی ہیں۔ میں نے جس قدر ان لوگوں کے اقوال نقل کیے ہیں وہ اس بارے میں کافی ہوں گے کہ ناظرین اس مسئلہ کے متعلق نمائشی چشم دید حالات اور سنے سنائے

تعریفی بیانات کے خلاف حقیقت ہونے پر ہمارے ہم خیال بن سکیں۔ ورنہ اگر ہم اپنی رائے کی جانبداری میں خودان گھر والوں کو جو اپنے حالات سے بخوبی واقف ہیں جھوٹا قرار دیں تو لامحالہ ہمیں اس غلطی کا سخت رنج وخمیازہ بھی بھگتنا ہوگا۔

علاوہ بریں یہ مسئلہ فی الحقیقت ابھی نہایت سیدھا سادہ ہے اور اس قابل نہیں ہے کہ اس کا لب لباب معلوم کرنے کے لیے کسی سخت دماغی محنت اور غور وفکر کرنے کی زحمت گوارا کرنی پڑے۔ کائنات کے احوال اور مراتب میں معمولی غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ جل شانہ نے ہر ایک مخلوق کو اس کی ضرورت معاش اور ادائے فرائض خاص کر مناسب حال اعضاء اور قابلیتیں عطا فرمائی ہیں تا کہ وہ اپنا قدرتی کمال بخوبی حاصل کر سکے لیکن اس کے ساتھ کسی وقت وہ مخلوق اپنے دائرے سے باہر بھی نکل سکتی ہے اور اپنے وظیفہ فطری کے سوا دوسرے کام بھی سرانجام دے سکتی ہے۔ اس صورت میں بمقتضائے:

كُلُّ جَدِيْدٌ لَذِيْذٌ.

اس کی حالت کچھ دیر کے لیے دل پسند ہوتی ہے جس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ مخلوق اس پسندیدگی کی اہل ہے بلکہ اس وجہ سے کہ ہر ایک نئی بات کا خوش آئند ہونا تقاضائے فطری ہے مگر جب کچھ عرصہ تک وہ حالت پیش نظر رہے اور یہ معلوم ہو جائے کہ اس طریق پر وہ مخلوق اپنی ترکیب وفطرت کے احکام سے خلاف ورزی کر رہی ہے تو اب بجائے پسندیدگی کے اس کی یہی حالت مکروہ اور بدنام ہونے لگتی ہے اور وہ تمام خرابیاں جو پہلے پہل اس متغیر حالت میں پائی گئی تھیں مجسم عیوب و نقائص نظر آنے لگتی ہیں مثلاً آج ہم جس وقت یہ سنتے ہیں کہ ہماری سوسائٹی میں کوئی عورت اعلیٰ درجہ کی پولیٹیکل قابلیت سے بہرہ ور ہوئی ہے تو ہمارا دل خوشی سے باغ باغ ہو جاتا ہے اور ہم بے اختیار اس نئی عورت کی تعریف کر کے اسے عالم نسواں میں کمال نسوانی کی مثال تصور کرتے ہیں اور اخبارات میں اس کے لیکچرز اور مضامین پڑھ کر اتراتے پھرتے ہیں لیکن جب اس کے بعد اور بھی بہت سی پولیٹیکل معاملات میں دخل دینے والی، علم طبیعات کی ماہرہ اور انجینئری میں مہارت

رکھنے والی مستورات پیدا ہو جاتیں اور حادثات طبعی اپنی زبان حال سے ہم کو یہ خبر دیں کہ اس نئی بدعت سے ہم پر کوئی تازہ آفت آنے والی ہے تو فوراً ہی ہمارے افکار کا رخ بدل جائے گا اور ہم ان مرد بننے والی عورتوں سے ناراض ہو کر ان کی یہ حالت دیکھنی پسند نہ کریں گے مگر اس وقت تاسف کرنے سے ہم کو فائدہ کیا ہوگا؟ کچھ بھی نہیں کیونکہ اس وقت تک حالات کی اقتداء نے ہمیں سوسائٹی اور معاشرت کی ایک جدید شکل میں داخل کر دیا ہوگا اور ہم اپنے آپ کو دو خطرناک موجوں کے جائے اتصال پر کھڑے ہوئے دیکھیں گے۔ اگر ہم عورتوں کو اس حالت سے باز رکھنے کی کوشش کریں گے تو چونکہ ہماری اس وقت کی تمدنی حالت موجودہ حالت سے بہت کچھ بدل گئی ہو گی اس لیے ہم ترقی یافتہ جنس نسواں کو چھیڑ کر آفت بالائے آفت برپا کریں گے اور اگر ہم نے عورتوں کو ان کی حالت پر چھوڑ کر جس طریقہ پر وہ چل رہی ہوں چلنے دیا تو اس کا انجام یہ ہوگا کہ مرض لاعلاج ہو جائے گا اور ہمیں بھی وہی شکایتیں پیش آئیں گی جو یورپین اقوام کے علماء کو در پیش ہیں اور جن کی فریادوں کا کچھ نمونہ ہم اپنی اس کتاب میں دکھا بھی چکے ہیں۔

لیکن ہم جس وقت یہ سنتے ہیں کہ یورپ میں انجینئری، ڈاکٹری اور سیاسی امور میں عورتیں برابر حصہ لے رہی ہیں تو بس ہم وفور حیرت و مسرت سے مدہوش ہو کر اپنی ہستی پر غور کرنا بھول جاتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ ہم آئندہ پیش آنے والی دقتوں پر ذرا بھی غور نہیں کرتے اور اس بات پر تیار ہو جاتے ہیں کہ عورتیں جس طرح یورپ میں علم و کمال کے معراج پر چڑھ رہی ہیں ہماری عورتیں بھی اسی طرح علمی اور اخلاقی ترقیوں کے زینے طے کرنے لگیں اور پھر ہم میں سے جو شخص اس تحریک کو روکنا چاہے اس پر متعصب، وہم پرست اور ضعیف الاعتقادی و تنگ خیالی کا الزام لگا کر اسے برا بھلا کہنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں اور اگر ہم ان سے یہ کہیں کہ صاحبو! جن یورپین لوگوں کی حالت کو تم نظیراً پیش کرتے ہو وہ خود ہی ان ڈاکٹر، انجینئر اور فلاسفر عورتوں کے وجود سے تنگ آ گئے ہیں۔ اب انہیں عورتوں کے یہ القاب مطلقاً پسند نہیں آتے اور ان پر احکام فطرت کی خلاف ورزی سے آخر کار مصیبت آنے کا حال کھل گیا ہے جس کی وجہ سے وہ

برابر اس کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں۔قلم اور زبان سے کام لے کر اپنی قوم کو آئندہ اور موجودہ خرابیاں دکھا کر ڈراتے اور سمجھاتے ہیں کہ جس قدر ممکن ہو سکے اس حالت کو بدلنے کی سعی کی جائے لیکن ہمارے روشن خیال احباب اس بات کو مناظرہ میں مغالطہ دینا تصور کرتے اور کسی کی نصیحت ماننے پر تیار نہیں ہوتے وہ یورپین عورتوں کی کامیابی کے قصے سن کر اور ان کا کاروباری زندگی میں حصہ لینا معلوم کر کے ایسے از خود رفتہ ہو رہے ہیں کہ اندیشہ انجام اور عقل سلیم کی ہدایتوں کو اپنے پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتے۔

لیکن کیا کیا جائے؟ یہ ایک قانون قدرت ہے یا یوں کہو کہ ایک تمدنی فتنہ وآفت ہے جو زور آور قوموں کی طرف سے مغلوب اور کمزور قوتوں پر سحر وافسوں سے بھی بڑھ کر اثر انداز ہوتا ہے یہاں تک کہ آج اہل ایشیا کی بہت سی عادتیں ایسی ہیں جو محض یورپ کی تقلیدی ہیں اور اگر ان مقلدوں سے ان حالات کا مفہوم اور ان کی تقلید کی وجہ دریافت کی جائے تو وہ کچھ جواب ہی نہیں دے سکتے۔ایک معمولی سی مثال یہ ہے کہ ہر وقت لوگ آپس میں ایک دوسرے کو سلام کرنے کے لیے غیر زبانوں کے ہی سلام استعمال کرتے ہیں حالانکہ وہ اس زبان کا ایک حرف بھی نہیں جانتے اور نہ اس کا عمدہ طور سے تلفظ کر سکتے ہیں۔یہ تو ہر ایک پسماندہ قوم کے افراد کی حالت ہے مگر ان کے خاص افراد کو لازم ہے کہ وہ اس پستی کے گڑھے میں گرنے سے اپنے تئیں بچائیں اور اپنے آپ کو ایسی قابل تقلید مثال اور رہنمائی کا نشان بنائیں جن کو دیکھ کر بھولے بھٹکے افراد راہ راست پر پہنچ سکیں اور فتنہ ایام کی لپیٹ میں آنے سے بچنے کے لیے ان کی زیر سایہ پناہ لے سکیں۔کتاب ''المراۃ جدیدہ'' کے مولف نے رسم پردہ پر حملہ کرنے اور اس کی برائیاں دکھانے میں بخیال خود ایشیائی ممالک کی عورتوں کی خراب حالت اور کثرت طلاق کی پرزور دلیلیں پیش کی ہیں اور اسے ختم کر دینے کی صلاح دی ہے مگر ہم کہتے ہیں کہ ان کی تمام دلیلیں نامقبول ہیں بلکہ ہمارا قول ہے کہ پردہ ہی ایک ایسی چیز ہے جس نے عورتوں کو موجودہ حالت سے ہزار درجہ بڑھ کر خراب حالت میں مبتلا ہونے سے بچائے رکھا ورنہ نہیں معلوم آج ان کا کیا حشر ہوتا۔اب جب کہ جاہل اور حقیر عورت کے حق میں پردہ بہت سے مہلک اجتماعی امراض سے محفوظ رکھنے کا ذریعہ ہے اور بہت سی آفتوں سے ان کا محافظ ہے تو ضرور ہے کہ جس وقت عورت علم ولیاقت کے زیور سے آراستہ ہو

گی۔خواہ وہ اوسط درجہ کی تعلیم ہی کیوں نہ پائے۔اس وقت بھی پردہ اسے اپنے وظیفہ طبعی کی مسند عزت پر بٹھانے اور اسے اپنا اصلی کمال حاصل کرنے کی ہدایت کے لیے سب سے بڑھ کر کارآمد ذریعہ اور رہنما ہوگا۔

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بارے میں اس قدر حیرت کیوں ہے؟ کیا دنیا اور اس کے حوادث اس بات کے شاہد عادل نہیں کہ اگر عورتوں کو پردہ کی طرف منسوب کی جانے والی خرابیوں سے بچانے میں صرف بے نقاب اور بے پردہ پھرنا ہی سب سے بڑھا ہوا اور یکتا حل مانا گیا ہے تو کیا وجہ ہے کہ یورپین ممالک میں بھی یہ تمام علتیں زور و شور کے ساتھ موجود ہیں؟ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے کیونکہ جس شخص کو حالات عالم پر اطلاع حاصل ہے اسے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو آزادی دلانے والے حضرات جن خرابیوں کا رونا روتے ہیں وہ خرابیاں بجنسہ اس مادی مدنیت میں بھی موجود ہیں۔

تنگ دستی اور تباہ حالی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو خود کتاب ''المراۃ جدیدہ'' کے مولف کی شہادت سے پتہ چلتا ہے کہ یورپین مدنیت میں یہ حالت بہ نسبت ہمارے ملک کے بدرجہا سخت تر پائی جاتی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

مردم شماری کی آخری رپورٹوں کی رو سے ملک مصر میں ۶۲۷۳۱ کاروبار اور مزدوری کرنے والی عورتیں ہیں لیکن اس کے بالمقابل فرانس میں پانچ ملین سے زیادہ عورتیں اپنی روٹی ذاتی محنت و مزدوری سے پیدا کرنے پر مجبور ہیں۔اب اگر ان دونوں مقاموں کی مردم شماری کا تناسب دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ فرانس میں چودہ فیصدی اور مصر میں ۱/۲ عورتیں محنت مزدوری کرنے والی پائی جاتی ہیں جو اس بات کی محسوس دلیل ہے کہ مدنیت کے سب سے اچھے ملک میں بھی بہ نسبت ہمارے ملک کے مصری عورتوں پر فاقہ زدگی کی بڑھی ہوئی آفت نازل ہے لیکن فاضل مولف نے اس بات کو تحریر کرنے کے بعد یہ بھی لکھ دیا ہے کہ:

> ''ان عورتوں کے محنت مزدوری اور کاروبار کرنے سے ان کے گھرانوں پر کوئی ضرر عائد نہیں ہوا ہے۔''

سبحان اللہ! یہ قول بدیہی محسوس حالت کے بالکل مخالف اور خود علمائے تمدن یورپ کے اقوال کے برعکس ہے، ہمارا فرض ہونا چاہیے کہ جب ایسے مسئلہ پر اختلاف رائے کا موقع پیش آئے تو اپنی رائے کی تائید کے لیے خود اسی گھر کے رہنے والوں اور علم اقتصاد کے ماہر استادوں کے اقوال سے استشہاد کریں، کیوں کہ وہ لوگ اپنی حالت سے خبردار اور اس کے نشیب وفراز سے بخوبی واقف ہیں۔ مشہور اقتصادی فلاسفر ''ژول سیماں'' جو انیسویں صدی کا علامہ دہر مانا گیا ہے وہ تو خاص سرزمین یورپ میں چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ کارخانوں اور فیکٹریوں نے عورت کو اس کے گھرانے سے نکال لیا ہے اور منزلی زندگی کے اصول کو توڑ کر پارہ پارہ کر ڈالا ہے مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ عورت کے کاروباری خارجی زندگی میں شریک ہونے سے ان کی منزل زندگی پر کوئی برا اثر نہیں پڑا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اکیلا ''ژول سیماں'' ہی اس حقیقت کا ادراک کرنے والا نہیں پایا جاتا بلکہ بلا استشہاد تمام علمائے عمران اور تمدن اسی کے ہم سفر اور ہم خیال ہیں چنانچہ مزید استدلال اور مخالفین کو قائل بنانے کے واسطے ہم ذیل میں علامہ ''سامویل سمائیل'' کا وہ قول بھی نقل کیے دیتے ہیں جو اس نے اپنی کتاب ''الخلاق'' میں لکھا ہے:

جو دستور عورتوں کو دخانی کارخانوں میں کام کرنے کی اجازت دیتا ہے اس سے خواہ ملکی ثروت کتنی ہی کیوں نہ ترقی کر جائے لیکن اس میں شک نہیں کہ اس نظام کا نتیجہ حیات منزلی کی بنیادیں متزلزل کر دینے والا ثابت ہوا ہے۔ وہ کارخانہ داری کے طرز زندگی پر حملہ آور ہوا ہے اور اس نے گھرانے اور کنبے کی شاندار عمارت کو منہدم کر کے معاشرت کی بندشیں بالکل توڑ پھینکی ہیں، اس حالت نے بیوی کو شوہر اور اولاد کو ان کے رشتہ داروں سے چھین کر ایک ایسی خاص نوعیت اختیار کر لی ہے جس کا نتیجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ عورت کی اخلاقی حالت ابتر ہو جائے کیونکہ عورت کا حقیقی وظیفہ واجبات منزل کو ادا کرنا تھا، اپنے مکان رہائش کی ترتیب و آراستگی اپنے بچوں کی تربیت اور خانگی ضرورتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے وسائل معیشت میں انتظام و کفایت شعاری برتنا مگر کارخانہ نے عورت کو ان تمام واجبات

سے الگ کر دیا ہے۔اب گھر، گھر نہیں رہ گئے۔اولاد کو تربیت نہیں ملتی۔وہ لاپرواہی کے عالم میں پڑی رہتی ہے۔زن وشوئی کی آتش محبت سرد ہوگئی ہے اور عورت کی وہ حالت نہیں رہ گئی کہ وہ ایک خوش مزاج بیوی اور مرد کی محبوب مانی جائے بلکہ وہ محنت ومشقت برداشت کرنے میں مرد کی مدمقابل اور حریف بن گئی ہے اسے اس قسم کی تاثیرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو اکثر حالتوں میں دماغی اور اخلاقی فروتنی کو محو کر دیتی ہیں، وہ دماغی واخلاقی تواضع جس پر اس کی فضیلت کی حفاظت کا دارومدار تھا۔

اس عبارت کو پڑھ کر کیا شک رہ جاتا ہے کہ یورپین عورتوں میں جاں گداز تنگ دستی اور قابل رحم حالت مشرقی ممالک کی عورتوں سے اس قدر زیادہ پائی جاتی ہے جس کا اندازہ کرنا مشکل ہے اور یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ عورتیں منزلی دائرے سے نکل کر خارجی کاموں میں مصروف ہونے کی وجہ سے نہایت نازک اور ناگفتنی حالت میں مبتلا ہو رہی ہیں جس کا پتہ علمائے یورپ ہی کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے اور ہمیں اس بات کا کوئی حق نہیں کہ ہم خود گھر کے مالکوں کو اپنے گھر کے بارے میں غلط بیانی کرنے والا تصور کریں اس لیے اگر پردہ نہ کرنا عورتوں کی خوشحالی یا کم از کم ان کی مصیبتوں کو ہلکا بنانے والا امر ہوتا تو یورپ کی عورتوں پر ایسی آفت ہرگز نہ آتی۔

اب کثرت طلاق کے لحاظ سے دیکھا جائے تو آج جو ملک مدنیت اور خوشنمائی کے اعتبار سے دنیا میں بڑھا ہوا ہے اس میں یہ خطرناک علت بھی اس قدر حد سے بڑھ گئی ہے کہ وہاں کے علماء اور روشن دماغ فلاسفر اسے دیکھ دیکھ کر بے چین ہوتے لیکن اس کے روکنے کی کوئی تدبیر نہیں کر سکتے۔فرانس کے رسالہ ''ریویو آف ریویوز'' جلد ۲۵ میں ایڈیٹر کے حسب خواہش مشہور امریکن مضمون نگار اور اہل قلم ''لوسن'' نے ایک نقشہ ان طلاقوں کے شمار واعداد کا شائع کیا تھا جو ممالک امریکہ میں روز بروز کثرت سے واقع ہوتے جاتے ہیں۔اس جدول کے ملاحظہ کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ ریاست ومساشوزیت میں صرف ایک سال ۱۸۹۴ء میں ۱۶۲۲ طلاق کی درخواستیں گزریں حالانکہ اس سے قبل جو سال گزرا ہے اس میں ۷۷ طلاق واقع ہوئے تھے۔اس سے یہ

ثابت ہوا کہ طلاق کی تعداد بہت تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور اسی ملک میں ۱۸۸۷ء میں ہر ایک ۱۰۵ شخصوں میں ایک شادی ہوتی تھی مگر ۱۸۹۴ء میں ۱۲۲ شخصوں میں ایک شادی کا اوسط نکلتا ہے جس سے شادی شدہ لوگوں کی کمی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

ملک اہیو (امریکہ) میں بھی اعداد و شمار کی یہی افسوسناک حالت مشاہدہ کی جاتی ہے جہاں ۱۸۶۵ء میں یعنی ۳۵ سال پہلے ۲۲۱۹۸ شادیاں درج رجسٹر ہوئیں جن میں ۸۳۷ میں طلاق واقع ہوئے یعنی تقریباً ہر ۲/۲۶۱ شخصوں کے مقابلہ میں ایک طلاق ہوئی لیکن ۱۸۹۴ء میں ۳۳۸۵۸ شادیاں درج رجسٹر ہوئیں اور طلاق کی تعداد ۳۸۵۳ یعنی فی ۲/۱۲۱ شادیوں میں صرف ایک طلاق واقع ہوئی۔

اور مشاہدہ کیا گیا ہے کہ اس ملک میں صرف دس سال کے اندر طلاق کی تعداد اس کی اوسط سے بمقدار ۱۱۰۰۰ کے بڑھ گئی اور شادیوں کی تعداد اپنی اوسط سے بمقدار ۸۴۸۸۹ گھٹ گئی۔
مضمون نگار نے ان اعداد و شمار پر لکھا ہے کہ:

''اگر امریکن عورت کی زندگی جدید طوفانی موجوں کے تھپیڑوں میں نہ پڑ گئی ہوتی تو اس میں شک نہیں تھا کہ اس وقت ملک آہیو میں ۴۲۵۶ گھرانوں سے کم گھرانے نہ ہوتے۔''

کیلی فورنیا میں جو ممالک متحدہ امریکہ کی ایک ریاست ہے ۱۸۹۷ء میں ۲ ہزار شادیاں ہوئیں اور ان میں سے ۶۴۱ میں طلاق واقع ہوئی یعنی ہر ۳ شادیوں میں سے ایک انجام طلاق نکلا۔
غرض کہ ریویو آف ریویوز کی مذکورہ بالا جلد میں لوسن نے جو سرکاری رپورٹ، طلاق کے اعداد و شمار کے متعلق درج کی ہے اس سے اکثر ولایات ممالک متحدہ میں واقع ہونے والی طلاقوں کا شمار معلوم ہو سکتا ہے اور وہ حسب ذیل ہے:

ریاست کونیکوٹ میں	فی دس شادیوں میں ایک طلاق
ریاست مساسوزیت میں	فی ۲۱ شادیوں میں ایک طلاق
ریاست روسلان میں	فی ۱۳ شادیوں میں ایک طلاق
ریاست شکاگو میں	فی ۸ شادیوں میں ایک طلاق

اور شمار و اعداد کی رپورٹوں سے واضح ہوا ہے کہ شکاگو کا محکمہ ہر سال ۳۵۰ طلاق درج رجسٹر کرتا ہے حالانکہ وہاں کے باشندوں کا شمار ۲۳۰۰۰۰ سے زائد نہیں۔ ان امور کا ذکر کرنے کے بعد لوسن لکھتا ہے:

''خلاصہ یہ کہ اب طلاق کا رواج حد سے بڑھ گیا ہے اور جو امر سخت خوفناک ہے وہ یہ ہے کہ ۸۰ فیصدی طلاق کی درخواستیں عورتوں کی جانب سے پیش ہوئی ہیں اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرد کو فسخ زواج (طلاق) کا بہت کم خیال گزرتا ہے کیونکہ وہ اپنی عورت کو طلاق دینے سے بے حد شرمندہ ہو جاتا ہے اور اس لیے جس وقت مرد اپنی بیوی کے ہاتھوں سے تنگ آ جائے تو پہلے وہ کسی دوسری عورت کو تلاش کرتا ہے اور جب تک دوسری مطلوبہ عورت اس سے شادی کرنے پر رضامندی ظاہر نہ کرے وہ ہرگز پہلی سے علیحدگی اختیار کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔''

اس فاضل مضمون نگار نے امریکہ میں طلاق کے ایک بالکل آسان امر کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''اور بہت سے شوہروں کو اپنی عورتوں کے ان سے طلاق حاصل کر لینے کی خبر ہی اس وقت ملتی ہے جب وہ دوسرے مرد سے شادی کر چکی ہوتی ہیں۔''

اب دیکھنا یہ ہے کہ طلاق کا سبب کیا ہوتا ہے؟ بسا اوقات اس کا باعث یہ ہوتا ہے کہ مرد اپنی بیوی کا نان و نفقہ ادا نہیں کرتے اور انہیں مجبوری کے عالم میں تنہا چھوڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ مسٹر لوسن لکھتا ہے:

''پارسال یعنی ۱۸۹۷ء میں بمقام بوسٹن عدالت عالیہ کا افتتاح ہونے پر برابر تین دن تک عدالت میں مردوں اور عورتوں کا ایک ہجوم لگا رہتا تھا جو سب کے سب طلاق کے طلب گار تھے لہٰذا پہلے ہی ہفتہ میں ۷۵ طلاق جاری ہوئیں اور بالعموم طلاق کا یہی سبب پایا گیا کہ مردوں نے اپنی بیویوں کو چھوڑ دیا تھا۔''

غرض یہ کہ اعداد و شمار اور ناگوار شکایتیں صاف بتا رہی ہیں کہ جس علت کا رونا کتاب ''المراۃ جدیدہ'' کے فاضل مولف روتے ہیں وہ مدنیت و ترقی کے سب سے عظیم الشان ملک میں بھی موجود ہے اور اگر اس کا باعث پردہ ہوتا تو ضرور تھا کہ وہاں اس خوفناک درجہ تک یہ صورت نظر نہ آتی۔ غالباً ہمارا یہ کہنا کسی قدر حیرت انگیز ہوگا کہ ممالک امریکہ میں طلاق کے واقعات ناگوار اور خوفناک حال

تک پہنچ گئے ہیں لیکن ہم نے اس میں کچھ بھی مبالغہ نہیں کیا کیونکہ خود وہاں کے رہنے والے اور گھر کے بھیدی لوگ یہی کہتے ہیں جیسا کہ ریویو آف ریویوز میں مذکورہ بالا اعداد و شمار کا اندراج کرنے کے بعد یہ عبارت تحریر کی گئی ہے:

"بہر حال اب سوسائٹی اور معاشرت کی چادر میں آگ لگ گئی ہے مگر نہ صرف اس کے دونوں کناروں ہی میں آگ لگی ہے بلکہ یار لوگ اسے وسط سے بھی جلانے کی کوشش کر رہے ہیں اور ان میں ذرا بھی شک نہیں کہ گھریلو زندگی کو منہدم کرنے میں نئے زمانہ کی عورت کا بڑا ہاتھ ہے۔"

خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ ہم اوپر لکھ آئے ہیں اسے ایک سرسری نگاہ سے دیکھ لینے کے بعد ہمیں لامحالہ یہی مان لینا پڑے گا کہ جن امور کی شکایت کی جاتی ہے ان کے زائل کرنے کے واسطے ہمیں صرف تھوڑی سی تہذیب کی ضرورت ہے جس کے ساتھ ہی پردہ کا دوام و قیام بھی لازم ہے کیونکہ یہی پردہ عورت کے استقلال کا یکتا ضامن اور اس بات کا واحد کفیل ہے۔ جب بھی اللہ نے حدود طبعی کے دائرے سے قدم باہر رکھا فوراً اس کے کمال کو زوال لاحق ہوگا اور وہ تباہی و ہلاکت کی غار میں جا گرے گی جس کو ہم تمدنی اصول سے واضح طور پر ثابت کر چکے ہیں۔ جہاں تک تربیت کا تعلق ہے بالکل سادہ اور معمولی تربیت سے بھی ماں بننے والی عورتوں کی جہالت دور ہو سکتی ہے اور وہ اپنے گھروں کی حالت درست رکھنے اور اپنے شوہروں کو خوش رکھنے کے لائق بن سکتی ہیں۔

اسی بسیط تربیت کے ذریعہ سے تمام خرابیوں اور برائیوں کی جڑ کٹ جائے گی یا وہ اس قدر کم ہو جائیں گی کہ گویا باقی ہی نہیں رہیں، پھر گھر کی حالت سدھر جانی یقینی بات ہے اور عورت کا ایسی سعادت و مسرت کا مخزن بن جانا لازمی ہے جس کی وجہ سے گھر کے رہنے والے پرلطف زندگی بسر کرنے لگیں گے، ہمارے اس دعویٰ کی ایک محسوس دلیل یہ ہے کہ ہماری قوم کے اوسط درجہ کے تعلیم یافتہ طبقوں میں اس قسم کی علتیں اور خرابیاں شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہیں حالانکہ اسی کے بالمقابل ہم دیکھتے ہیں کہ مادی مدنیت کے ممالک میں زن و شوئی کے تعلقات روز بروز خلل پذیر اور خوفناک برہمی کی صورت میں جلوہ گر ہوتے جاتے ہیں جس کی شہادت مذکورہ سابق اعداد و شمار اور بہت سی دوسری باتوں سے بھی بہم پہنچتی ہے مگر ہم بخوف طوالت یہاں اس سے زیادہ تحریر نہیں کرتے اور یہ

بھی مسلمہ امر ہے کہ یورپین ممالک کے طلاق دینے والے مرد یا طلاق لینے والی عورتیں بہ نسبت ہمارے ان طبقوں کے جن میں طلاق کی واردات شاذ و نادر ہوتی ہے، علم وتہذیب کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوتے ہیں، اس لیے اگر ہمارے یہاں عورتوں کی جہالت اور بدتہذیبی کثرت طلاق کی موجب مانی جائے تو تعلیم یافتہ یورپین عورتوں میں اس ناپسندیدہ امر کا اتنا خوفناک شیوع کیوں پایا جاتا ہے؟ اور یہی سرسری نظر اس بات پر دلالت کرنے کے لیے کافی ہے کہ کثرت طلاق اور منزلی جھگڑوں کے موجب جہالت اور پردہ کے نقصانات کے علاوہ کچھ اور ہی ہیں۔

پھر اگر ہمارے یہاں مرد عورتوں کو اس لیے بے نان ونفقہ چھوڑ دیتے ہیں کہ ان کی نگاہوں میں عورتوں کی کوئی عزت و وقعت نہیں تو ضروری تھا کہ یہ آفت مادی مدنیت والوں میں بالکل نہ ہوتی، اس لیے کہ ان میں اس کا سبب زائل ہو چکا ہے۔ وہ لوگ بالعموم عورتوں کی عزت کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس قدر مدارات اور پاس ولحاظ ہم عورتوں کا کرتے ہیں مشرقی قوموں میں اس کا اثر ذرا بھی نہیں پایا جاتا۔ ہم نے مانا کہ ان کا دعویٰ صحیح ہے لیکن اس کی وجہ کسے قرار دیا جائے۔ اعداد وشمار سے طلاق کی زیادہ تر بلکہ عام درخواستیں اس شکایت کی بنیاد پر گزرتی ہیں کہ مردوں نے عورتوں کو روٹی کپڑا نہیں دیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ عورتوں کو حقیر و ذلیل تصور کرتے ہیں تو یہ درست نہیں کیونکہ ان کا دعویٰ اس کے برعکس ہے یعنی عورتوں کی خاطر داری میں اپنی جان تک فدا کر دینے کے مدعی ہیں اور اگر ان کو نامہذب اور جاہل خیال کیا جائے تو یہ بھی سراسر غلطی ہے کیونکہ یورپ کا کوئی شخص ایسا نہیں ہوگا جسے کم از کم لکھنا پڑھنا نہ آتا ہو، اس لیے ماننا پڑے گا کہ اس معلول کی اور ہی علت ہے۔

آزادی نسواں کے طلبگار بہت زور دے کر کہتے ہیں کہ پردہ اس بات میں سخت حارج ہوتا ہے کہ مرد اپنے مناسب حال عورت کو تلاش کر سکے اور اسی پردہ کے باعث مرد کو اس بات کا موقع نہیں ملتا کہ وہ شادی سے قبل اپنی بیوی کے عادات واطوار سے واقفیت حاصل کر لے اور اس بات کا اندازہ کر سکے کہ آیا وہ عورت کے ساتھ شادی کرنے کے بعد پرلطف زندگی بسر کر سکتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ اسی علت کو کثرت طلاق کی بنیاد بھی قرار دیتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اول تو ہمارے اعلیٰ طبقوں اور وسط درجہ کے روشن خیال طبقوں میں طلاق کی وارداتیں یوں ہی شاذ و نادر وقوع پذیر

ہوتی ہیں بلکہ بالکل نہیں ہوتیں اس لیے اگر طلاق کا سبب یہی ہوتا ہے کہ مرد کو شادی کرنے سے پہلے عورت کے اخلاق و عادات کے پردہ کی قید و بند کی وجہ سے تجربہ نہیں ہو سکتا تو ضروری تھا کہ ان دونوں طبقوں میں بھی کثرت سے طلاق دی جاتی جیسے عام اور ادنیٰ درجہ کے لوگوں میں واقع ہوتے ہیں مگر یہاں تو معاملہ اس کے برعکس دیکھا جاتا ہے۔

دوئم: یہ کہ اگر شادی سے پہلے مرد کا عورت کی طبیعت سے پوری طرح واقف ہو جانا اور اس کے مزاج کا تجربہ کر لینا عدم طلاق کے لیے کفیل بن سکتا ہے تو یورپین مدنیت کے رہنے والے جو پردہ کی قید سے آزاد اور خوش قسمتی سے اس نعمت کو حاصل کر چکے ہیں، ان کے ہاں کیوں اس کثرت سے طلاق کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں جن کو دیکھ کر ان کے دانشمند افراد سخت پریشان ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اس طرز عمل سے ان پر ایک نہ ایک دن عظیم الشان تباہی آنے والی ہے۔

سوئم: جب کہ وہ شادی جو باہمی محبت بلکہ عشق کے ذریعہ سے ہوئی ہو، عقد زوجیت کے قائم و باقی رہنے کی واحد ضامن قرار دی جاتی ہے اور ایسی محبت و الفت اس وقت پیدا ہوتی ہے جس وقت پردہ کی قید و بند نہ ہو تو یورپ والوں کو یہ نعمت بھی بخوبی حاصل ہے چنانچہ ان میں کوئی ایک شادی بھی کورٹ شپ کے بغیر نہیں ہونے پاتی پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان میں اس درجہ تک طلاق کی کثرت کیوں دیکھی جاتی ہے۔

جو شخص اس مسئلہ پر تحقیق کی باریک بین نظر ڈالنا چاہے اسے لازم ہے کہ مذکورہ بالا ابھرتے ہوئے اور نمایاں مسئلوں کو اپنا نصب العین بنائے تاکہ اسے علت کی ماہیت اور اس کے اصلی سبب کی عمیق تہہ کا ادراک ہو سکے، ورنہ ممکن ہے کہ سطحی باتوں سے مغالطہ میں پڑ جائے اور دریافت حقیقت سے قاصر رہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ طرز معاشرت کے ہر ایک پہلو پر غور کی نگاہ ڈالے اور جو امور ان باتوں کے مقتضی ہیں یا ان سے خلاف ہیں سب کو ایک دوسرے سے ملا ملا کر اور ان کی دقیق علمی تحقیق کر کے اچھی طرح چھان بین کر لے تاکہ مفروضہ بیماری کی سب سے اہم اور اعلیٰ علت کا پتہ لگ سکے، اب رہی یہ بات کہ ہماری معاشرت میں ایسی خرابیاں کیوں پڑ رہی ہیں؟ اس کی بابت ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ ہمارے مرد اور ہماری عورتیں دونوں ایک ناتربیت یافتہ اور غیر مہذب ہیں او

رہماری رائے میں اگر ان کو تھوڑی سی تہذیب و تربیت بھی حاصل ہو جائے تو ہماری سوسائٹی کی حالت اس قدر سدھر جائے گی کہ دوسری قومیں ہم کو رشک کی نگاہ سے دیکھنے لگیں گی اور ہم تمام دنیا میں قابل تقلید مثال بن جائیں گے۔ ہمارا یہ دعویٰ بے دلیل نہیں ہے بلکہ اس کی محسوس اور کھلی ہوئی دلیل یہ ہے کہ آج بھی ہمارے مہذب طبقوں میں اس بات کی مطلقاً شکایت نہیں پائی جاتی، اس لیے اگر ہم اس سے زیادہ مہذب اور تربیت یافتہ ہو جائیں تو یقیناً ہم پر ایک ایسا وقت آئے گا جبکہ ہمارے متمدن دوست اور مدنیت پسند علماء کو ایسی تشویشناک دقتوں کا سامنا بھی نہ کرنا پڑے۔ غرض یہ کہ ہماری موجودہ خراب حالت ایک طرح کے سطحی اعزاز ہیں جو بہت جلد زائل ہو سکتے ہیں اور ان کو دور کرنے کے لیے ہمیں اس بات کی کوئی حاجت نہیں کہ ہم اپنی موجودہ معاشرت کو مٹا کر پھر از سر نو اس کی تازہ بنیادیں رکھیں اور نئی عمارت بنائیں، ہمارا اعتقاد ہے کہ مسلمانوں میں پردہ کی رسم ایک رحمت الٰہی اور خدا کی جانب سے مقرر کیا ہوا محافظ ہے جس نے ہم کو مذکورہ بالا خرابیوں کے ہمارے معاشرتی جسم میں جڑ پکڑ لینے اور مہلک امراض بن جانے سے اب تک بچائے رکھا ہے۔

لیکن یورپین تمدن میں یہی خارجی باتیں ایسی اندرونی اور غیر زوال پذیر بیماریاں بن گئی ہیں، جن کی اصلاح کے لیے نہایت سخت اور ہولناک انقلاب کی ضرورت ہے اور جو شخص یورپ کے موجودہ حالات سے واقف ہے وہ اس کا اقرار کرنے والا ہے، علامہ ایڈولی جو پیرس کے کونڈرس کالج میں فلاسفی کا پروفیسر ہے مشہور انگریز انشاپرداز اور فلاسفر طامس کارلائل کی کتاب ''ہیروز لینڈ ہیروز شپ'' کے دیباچہ میں لکھتا ہے:

''اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانہ کی پیچیدگیاں سخت خطرناک ہیں مگر ساتھ ہی یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ حالت پہلی شفق سی ہے جو یورپ کے تمام افق پر نظر آ رہی ہے۔''

اس کے بعد علامہ موصوف نے ان بہت سی انقلابی حالتوں کی تفصیل دی ہے جو نوبت بہ نوبت یورپ پر طاری ہوتی رہیں اور جو سخت اجتماعی (معاشرتی) اضطرابات سے گھری ہوئی تھیں، بعد ازاں اس نے کارلائل ہی کے بیان کردہ حسب ذیل موقعوں سے استشہاد کر کے بتایا ہے کہ

ایسے انقلابات کا حادثات ہونا ایک لازمی امر ہے اور ان کے ساتھ ہی اضطرابات اور پریشانیوں کا وجود بھی ضروری ہے۔ کارلائل لکھتا ہے:

''یہ ایک ضروری امر ہے کہ ہر ایک بناوٹ اور جھوٹ کا پردہ فاش ہو کر اس کی جگہ سچائی اپنا جلوہ دکھائے یہ سچائی خواہ کسی قسم کی ہو اور چاہے جس ذریعہ سے آئے لیکن اپنا ظہور لامحالہ دکھائے۔ عام اس سے کہ صداقت کا غلبہ، خوف اور اضطراب کی وجہ سے ہو یا فرانسیسی بغاوتوں کی آفتوں کے ذریعہ سے یا کسی اور وسیلہ سے مگر اس میں شک نہیں کہ ہم آخر کار حقیقت کی طرف ضرور پلٹ آئیں گے لیکن یہ اصلیت جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے آتش دوزخ کے لباس میں ملبوس ہو کر عیاں ہوگی کیونکہ وہ بجز اس صورت کے اور کسی شکل میں نمایاں نہیں ہو سکتی۔''

ان تمام مراتب کے طے ہو چکنے کے بعد بھی اگر ہم میں کوئی ایسا شخص پایا جائے جو ان خوف دلانے والی باتوں اور دھونس دھڑکنوں سے متاثر نہ ہو اور اسی امر پر اصرار کرتا رہے کہ ہمیں ہر ایک بات میں یورپ کی مادی مدنیت والوں کی تقلید ہی کرنا چاہیے اور خاص کر مسئلہ نسواں میں تو ہمارے پاس اس کا کوئی علاج نہیں حالانکہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ مسئلہ نسواں کے خوفناک نتائج سے آج یورپ کے علماء اور خیر خواہاں قوم و ملک کا گروہ بڑا کانپ رہا ہے۔ وہ نامی اخباروں اور رسائل میں صاف صاف تحریر کرتے ہیں کہ ہماری سوسائٹی کی چادر کے صرف دونوں پلو ہی نہیں چلتے بلکہ اس کے وسط میں بھی آگ لگ چکی ہے اور ہم اس عبارت کو پہلے نقل بھی کر چکے ہیں اور وہی علمائے یورپ اپنے اعلیٰ درجہ کے علمی مجموعہ یعنی انسائیکلوپیڈیا میں یوں لکھتے ہیں:

''آخر اس حالت سے چھٹکارا پانے کی کیا صورت ہو سکتی ہے جو ہمیں اگر ہم اسے لاعلاج تنزل نہ کہیں تو بہت جلد بام عزت سے گرا دینے کی دھمکی دے رہی ہے۔''

اور یہ جملہ انیسویں صدی کی انسائیکلوپیڈیا سے لے کر ہم پہلے بھی نقل کر چکے ہیں۔

***

عورتوں کے زیادہ مناسب حال تعلیم

مسئلہ نسواں کی ایسی علمی تحلیل کرنے اور اس کے ہر ایک پہلو کو علم صحیح کی خوردبین سے دیکھ لینے کے بعد جب کہ ہمیں اس کی حالت و ماہیت کا پورا علم ہو گیا ہے اور ہم پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جو معمولی خرابیاں ہماری معاشرت میں عورتوں کے لیے لاحق ہو رہی ہیں، وہ محض ایسی تہذیب سے سدھر سکتی ہیں جس کی بنیاد حکیمانہ قواعد پر رکھی گئی ہو تو اب ہم پر واجب ہے کہ اس کے کسی مستحکم ترین اسلوب کو تلاش کریں جس کے ذریعہ سے ہم عورت کا وہ تہذیبی فرض ادا کرنے کے بارے میں سبکدوش ہو سکیں جو عمران الٰہی کے مؤسس اور مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر عمل پیرا ہونے کا حکم دیتا ہے کیونکہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم روحی فداہ کا ارشاد ہے:

طلب العلم فریضة علی کل مسلم ومسلمة.

اور اس کی پابندی ہم پر واجب ہے اور چونکہ ہمارے ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے:

خذ الحکمة ولا یفوك من ای دعاء خرجت.

اس لیے تعلیم کا وہ صحیح طریقہ جو عورتوں کے لیے زیادہ مناسب ہو، خواہ دنیا کی کسی قوم کے پاس ملے ہم کو اس کی تقلید کرنے میں زیادہ تعصب سے کام نہ لینا چاہیے اور اس کا کبھی نہ خیال کرنا چاہیے کہ وہ قوم دین اور دنیا دونوں کے لحاظ سے ہمارے حسب حال ہے یا ہم سے جداگانہ مگر دوسری جہت سے ہمیں یہ بھی مناسب نہیں کہ ہم کسی امر کے اختیار کرنے پر قبل اس کے کہ عقل وحکمت کے ذریعہ سے اس کی پوری چھان بین کریں یوں ہی جھک پڑیں۔ اس لیے کہ ہمارے پیشوا صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی فرمان ہے: المومن حل کا لہٰذا اگر ہم کو اپنا یوسف گم گشتہ کسی قوم کے پاس مل جائے گا تو ہم اسے سر آنکھوں پر لیں گے اور اسی طرح ایک عظیم الشان دینی ہدایت پر عمل کر سکیں گے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

الحکمة ضالة المومن یا خذھا ان وجدھا.

اور اگر ہمیں اپنا مطلوب کہیں نہ ملے تو ہم اپنے دل و دماغ سے کام لے کر اور اپنی ذہنی قوتوں سے مدد حاصل کر کے خود ایسا ہی ڈھنگ تجویز کریں گے جو فضیلت بشری اور فطرت انسانی پر پوری طرح منطق ہو اور اپنی جانوں پر رحمت الٰہی کی روح کے نازل ہونے کی دعا کریں گے تا کہ ہمیں وہ کسی اچھے اور سیدھے راستہ کی طرف ہدایت کرے کیونکہ خداوند کریم کی ہدایت ہم کو تلاش حق کے پیچھے بیکار ہاتھ نہ مارنے دے گی۔ اس نے ہم سے رہنمائی کا وعدہ کیا ہے اور خدا کا وعدہ سچا ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا:

وَ الَّذِیۡنَ جَاهَدُوۡا فِیۡنَا لَنَهۡدِیَنَّهُمۡ سُبُلَنَا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ (۶۹:۲۹)

اور جن لوگوں نے ہماری جستجو میں کوشش کی ہے بے شک ہم ان کو اپنی راہیں دکھائیں گے اور اس میں شک نہیں کہ اللہ نیکو کاروں کے ساتھ ہے۔

میرے خیال میں دنیا کی اور قوموں کے یہاں تعلیم نسواں کے جو اسلوب موجود ہیں ان پر نکتہ چینی کرنا اور انہیں پرکھ کر اپنے استعمال میں لانا سخت محنت مشقت کا بار برداشت کرنے کے ہم معنی ہے کیوں کہ ان قوموں میں جو عقلمند ہیں وہ خود اس بات کا اعلانیہ اقرار کر رہے ہیں کہ انہوں نے عورتوں کی تہذیب کے لیے جو طریقے وضع کیے تھے ان کا انجام سخت خراب اور باعث مصیبت نکلا ہے، اس لیے وہ تمام اسلوب حد درجہ عظیم الشان تغیر و تبدیلی کے محتاج ہیں۔ لہٰذا اس حالت میں ان کی تقلید کرنا نادانی اور حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ اور ایسی ناسمجھی جو ناقابل معافی ہو بلکہ ایسا امر جسے عقل کبھی قبول نہ کرے کیونکہ تجربہ کاروں کی نصیحتیں نہ ماننا اس کے ہم معنی ہے کہ اپنے آپ کو سخت ترین مصائب میں ڈال دیا جائے اور اپنے نفس کو تیر بلا کا نشانہ بنا دیا جائے۔

اب ہم اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کہ یورپ میں تعلیم نسواں کے طریقے جو حد درجہ مضرت رساں اور احکام خلقت نسائیہ پر غیر منطبق ہیں، روئے زمین کی سب سے بڑھ کر اور معزز ترین متمدن قوم کو انتخاب کر کے اس کے طریقہ تعلیم نسواں پر تبصرہ کرنا چاہتے ہیں۔ کون سی

قوم؟ جس کو آج تہذیب وتمدن میں اعلیٰ دست گاہ اور بہترین شرف حاصل ہے اور پھر اپنے مدعا کی بابت اس قوم کے عام لوگوں سے بھی استفسار نہ کریں گے۔ایسا علامہ جس کے فضل وکمال اور قومی غیرت مندی اور شرافت نسبی کو تسلیم کرنے پر اس قوم کے افراد میں اختلاف نہ پایا جائے۔

مشہور عبرانی فیلسوف ژول سیماں جس کی عزت فرانسیسی قوم خصوصاً اور دیگر یورپین قوموں میں عموماً اظہر من الشمس ہے۔ریویو آف ریویوز جلد ۹ میں لکھتا ہے:

''۱۸۴۸ء میں لوگوں کو یہ شکایت تھی کہ عورتوں کی تہذیب وتربیت پر ذرا بھی توجہ نہیں دی جاتی مگر آج دیکھا جائے وہ اس کے برعکس یہ شکوہ کر رہے ہیں کہ عورتوں کی تہذیب اعتدال کی حد سے گزر کر افراط کے مرتبہ تک پہنچ گئی۔ ہاں بلاشبہ ہم حد درجہ کی کمی سے نکل کر ہولناک افراط کے مرتبہ تک جا پہنچے ہیں۔''

اس کے بعد علامہ موصوف نے اس اسلوب تعلیم کے نتائج کی خرابی دکھا کر جس نے عورت کو بالکل مرد بنا دیا زور سے چیخ کر کہا:

''یہ واجب ہے کہ عورت عورت ہی رہے۔''

بعد ازیں اس نے وہ خرابیاں بیان کی ہیں جو عورت کی اس حالت سے گھرانوں پر طاری ہوئیں اور وہ باتیں ہم پچھلے ابواب میں بجنسہٖ نقل کر چکے ہیں جن کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ یہ بات تو فرانسیسی قوم کی لڑکیوں کی تہذیب وتعلیم سے مختص تھی۔اب انگریزی قوم کی حالت دیکھنا چاہو تو اس کی تعلیم نسواں کا ناپسندیدہ اسلوب بیان کرنے کے لیے ہم مشہور علامہ سامویل سمائلس کے اقوال سے استشہاد کریں گے جو انگلستان کا سب سے بڑا مصنف اور اعلیٰ اخلاق وتمدن کا علامہ تسلیم کیا گیا ہے اور جس کی متعدد تصانیف فرنچ زبان میں یا یورپ کی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔وہ اپنی کتاب ''خلاق'' میں تحریر کرتا ہے:

''ایک شریف اور رتبہ العائلہ عورت کی قدیم رومانیوں کے ہاں بڑی تعریف یہ تھی کہ وہ محض منزلی دائرہ میں محدود ہے اور صرف سوت کاتنے کا کام کیا کرتی تھی۔ ہمارے زمانہ میں کہا جاتا ہے کہ عورت کو علم الکیمیا کا صرف اس قدر حصہ سیکھنا چاہیے جس کے ذریعہ سے وہ ہانڈی

میں بال آنے کی صورت میں اس کی حفاظت کر سکے اور فن جغرافیہ سے اس کو صرف اپنے گھر کے مختلف سمتوں کی کھڑکیوں اور روشن دانوں کے فوائد کا امتیاز حاصل کرنا کافی ہے۔"

علاوہ بریں لاڈ بائرن جو عورتوں پر حد سے زیادہ فریفتہ اور ان کی اطاعت میں بدنام تھا لکھتا ہے کہ:

"عورت کے کتب خانہ میں بجز تورات اور طباخی کی کتابوں کے کوئی اور کتاب ہونی ہی نہیں چاہیے۔"

مگر بائرن کی یہ رائے عورت کے اخلاق اور اس تہذیب پر نظر کرتے ہوئے نہایت سخت گیری پر مبنی اور غیر معقول ہے۔ ایک طرف تو اتنی سخت گیری برتنے کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور دوسری جانب اس کے خلاف رائے جو آج کل بکثرت شائع ہو رہی ہے، وہ ولولہ جنون تصور کیے جانے کے قابل اور نظام فطرت پر بالکل غیر منطبق ہے کیونکہ وہ عورت کو اس قدر تہذیب دینے کی مقتضی ہے کہ بقدر ارکان عورت مرد کے مساوی اور ہم مرتبہ بن جائے۔ یہاں تک کہ ان دونوں میں بجز جنسی فرق کے اور کوئی امتیاز باقی نہ رہے یعنی عورت و مرد کے حقوق ہر طرح مساوی ہوں۔ سیاسی معاملات میں ان کی رائے کی قدر کی جائے اور عورت بھی تمام وحشت خیز اصول زندگی کے معرکوں میں مرد کی مد مقابل بن سکے۔

اب صرف امریکن قوم باقی رہ جاتی ہے۔ اس کے اسلوب تعلیم نسواں کی عدم صلاحیت دکھانے کے لیے محض نامور انشاپرداز لوسن کی شہادت کافی ہے جس نے فرانس کے رسالہ "ریویو آف ریویوز" میں حسب الطلب ایڈیٹر رسالہ امریکن عورتوں کی حالت پر ایک بسیط مضمون دیا تھا اور وہ جلد ۲۵ رسالہ مذکور میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں لوسن نے مدارس نسواں کی دگرگوں حالت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدرسے ان نوجوان لڑکیوں کے لیے قائم کیے گئے ہیں جو اپنی معلومات کو کسب معاش کا مشغلہ بنانا چاہتی ہیں یا زنانہ ڈاکٹر، زنانہ انجینئر اور معلمہ وغیرہ بننا چاہتی ہیں۔ اس لیے دیکھا جاتا ہے کہ ان مدارس میں تہذیب کا درجہ بہت کم ہے (یعنی وہ

تہذیب جو عورت کے لیے خاص ہے) اور پڑھائی نہایت قوی ہے۔ عورتیں اور لڑکیاں نہایت تدقیق کے ساتھ علوم کیمیا، ریاضیات اور طبیعات میں تعلیم پاتی ہیں اور انہوں نے اگرچہ پروگرام کے تمام دفعات پر عبور کر لیا جاتا ہے لیکن وہ نظامات خانہ داری کے معمولی سے معمولی اور سادہ سے سادہ امور سے بھی سخت ناواقف ہوتی ہے۔''

یہ ان لوگوں کے اقوال ہیں جن کو صاحب خانہ کہنا چاہیے اور ہم کس دلیل سے ان کو جھوٹا قرار دے سکتے ہیں؟ بنابریں ہم مسلمانوں کو ان یورپین اسالیب تعلیم نسواں میں سے کسی اسلوب کی پیروی کی اسی وقت اصلاح دے سکتے ہیں جب کہ ان تمام اقوال کو ذرہ بھی قابل اعتنا نہ تصور کریں اور جو لوگ ان طریقوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں خواہ وہ اسی قسم کے چیدہ افراد ہی کیوں نہ ہوں، ان کو جہالت و بدنیتی کا الزام نہ دیں، غرض یہ کہ جب ہم کو یہی صورت پسندیدہ آتی ہے تو پھر جس کی تقلید کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ کوئی چیز اس بارے میں مانع نہیں ہو سکتی لیکن اگر امر حق کی پاسداری اور پابندی کا خیال ہے تو ہم پر لازم ہے کہ اہل یورپ کے حالات کو بنظر اعتبار دیکھیں او رجن باتوں نے انہیں جلد بازی کے خمیازہ میں مبتلا کر دیا ہے ان سے بچنے کی سعی کریں تاکہ آخرکار ہمیں بھی وہی کہنا پڑے جو علامہ ژول سیماں کہتا ہے کہ:

''پہلے ہم کو کمی تعلیم کی شکایت تھی اور اب اس کے برعکس ہم تعلیم کی زیادتی اور افراط کا رونا روتے ہیں۔''

❁ ❁ ❁

اجمالی نظر

گو ہم اپنی بحث میں حس اور تجربہ کے ایسے دلائل پیش کرنے کے راستے پر قدم زن رہے ہیں جن کو بجز اس کے اور کسی صورت میں غلط قرار نہیں دیا جاسکتا کہ پہلے ان کے چشم دید اور محسوس مقدمات کی تکذیب کر لی جائے جو ایک ناممکن امر ہے۔ تاہم مجھے یہ خوف ہے کہ موضوع بحث کے متعدد اقسام میں بٹ جانے سے مضمون طویل ہو گیا ہے اور ان حالات میں ممکن ہے کہ ناظرین کو وہ بہت سے نظریات یاد نہ رہے ہوں جو عورت کی پردہ نشینی کی ضرورت ثابت کرنے میں کارآمد ہو سکتے ہیں۔ اس لیے میں نے ارادہ کیا کہ ان امور کو بالا جمال چند صفحوں میں لکھ دوں تاکہ معمولی غور سے بھی ان کی اجمالی شکل پر احاطہ کرنا آسان ہو میں نے ان کی تفصیلی باریکیاں معلوم کرنے کا بار ناظرین کی یادداشت یا دوبارہ مطالعہ کتاب پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ نظریات حسب ذیل ہیں:

۱۔ عورت جسمانی اعتبار سے بہ نسبت مرد کے بہت کمزور ہے اور علم قبول کرنے میں بھی اس کا درجہ گھٹا ہوا ہے۔ عورت کی یہ کمزوری اس لیے نہیں کہ اس طرح وہ مرد کی مطیع اور اس سے حقیر بنی رہے بلکہ اس لیے کہ اس کا وظیفہ طبعی اور خاص فرض اس سے زائد قوت کا خواہاں ہی نہیں ہوتا۔ یہ ایک طبعی اور فطری حالت ہے یعنی عورت ہزار کوشش کرے کہ وہ جسم اور ادراک کے لحاظ سے مرد کی ہم پلہ بن جائے تو یہ ایک انہونی بات ہو گی اور وہ ہرگز اس مرتبہ نہیں پہنچ سکے گی۔

۲۔ ہر ایک مخلوق کا ایک خاص کمال ہے اور عورت کا کمال جسمی توانائی اور وسعت معلومات پر موقوف نہیں بلکہ وہ ایک روحانی قوت میں منحصر ہے جو عورت کو بہ نسبت مرد کے بہت زیادہ

اعلیٰ درجہ کی دی گئی ہے۔ وہ قوت کیا ہے؟ عورت کا دقیق اور زندہ شعور اور اس کے حد درجہ رقیق احساسات اور پھر ان سب پر بڑھ چڑھ کر عورت کا نیکی کے راستہ پر اپنی جان تک قربان کر دینے۔ اس لیے اگر یہ مواہب اور فطری قوتیں اپنے صحیح قواعد کے مطابق عورت میں نشو ونما پائیں تو وہ اپنے حقوق کی حفاظت و تائید کے لیے مرد کی طرح زور آور قوت بازو اور تیز دم تلوار کی محتاج نہ رہے بلکہ یہی باطنی قوتیں اس کو معاشرت کے ایک ایسے اعلیٰ مرتبہ پر پہنچا دیں کہ اس کے سامنے عزت وتکریم کے لیے مردوں کے سر خود بخود جھک جائیں لیکن خدائے کریم نے اس کے ساتھ ہی یہ فیصلہ فرما دیا ہے کہ عورت کی یہ اندرونی قوتیں اسی وقت نشو ونما پا سکتی ہیں جبکہ وہ مرد کے زیر اثر اور زیر حفاظت زندگی بسر کرے خواہ وہ اسی حالت میں رہ کر اپنے مواہب میں مرد پر فوقیت کیوں نہ لے جائے اور اسے اپنا بندہ بے دام کیوں نہ بنا لے۔ پھر بھی عورت کو یہ بات نہیں بھاتی کہ وہ مرد کو اپنی فطری خوبیوں کے دام میں اسیر کر لے کیونکہ ایسی بصورت واقع ہونے میں اس کے ہتھیار کی دھار میں فرق آ جاتا ہے اور اس کی فطری موہبت کی چمک دمک ماند پڑ جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ خود ایک ایسی کشمکش میں گرفتار ہو سکتی ہے جو اسے پسند نہ ہو۔

۳۔ عورت اس کمال کو اس وقت تک کبھی نہیں حاصل کر سکتی جب تک وہ کسی مرد کی بیوی اور چند بچوں کو صحیح تربیت دینے والی ماں نہ ہو اور اس کی کچھ یہی وجہ نہیں ہے کہ حق بہ حق دار رسید والی مثل ہو بلکہ عورت کے ملکات کا نشو ونما اور اس کے اندرونی جذبات کی تہذیب و درستی ہی اس حالت میں ہو سکتی ہے کہ وہ بیوی اور ماں بنے کیونکہ اسی غرض کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے۔

۴۔ عورت کا مردوں کے کاروبار میں حصہ لینا اور خارجی زندگی کے خطرناک معرکوں میں اس کا شریک بننا دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اپنے فطری جذبات کو قتل کر رہی ہے، اپنے ملکات کو مٹا رہی ہے اور اپنی رونق وطراوت کو پژمردہ، اپنی ترکیب کو خراب اور اپنی قوم

کے جسم میں خلل پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یورپین عورت کا منزلی زندگی کے دائرہ سے قدم نکالنا ان ممالک کے علماء کی نگاہوں میں قوم کے دل و جان پر زخم کاری نظر آتا ہے اور اس بات کا ایک نشان تصور کیا جاتا ہے کہ مرد چاہے تو عورت کو سخت سے سخت مصیبت و آفت میں مبتلا کر سکتا ہے۔ چنانچہ اب وہی علماء اس کی حالت کا دائرہ تنگ کرنے پر زور لگا رہے ہیں۔

۵۔ عام طور پر نوع انسانی کی بہتری اور خاص کر خود عورت کی بہبودی کے لیے عورتوں کا پردے میں رہنا ایک فطری امر ہے کیونکہ پردہ عورت کی خود مختاری و استقلال کا ضامن اور اس کی حریت کا کفیل ہے نہ کہ اس کی ذلت کی علامت اور اس کی اسیری کا پیش خیمہ ہے اور ہم اس بات کو بیان کر آئے ہیں کہ پردہ عورت کے کمال کا مانع نہیں بلکہ وہ اس کمال کے ذرائع و اسباب کا مہیا کرنے والا ہے۔ تاہم چونکہ ہر چیز میں نقصانات بھی ضرور ہوتے ہیں، اس لحاظ سے اگر پردہ میں بھی بعض جزدی خرابیاں پائی جائیں تو اس کے بالمقابل جو فوائد اور خوبیاں ہیں وہ حد سے بڑھ کر قیمتی ہیں اور سب سے زائد خوبی یہ ہے کہ پردہ عورت کو اپنے وظیفہ طبع کے دائرے سے قدم باہر رکھنے میں مانع ہے۔ وہ وظیفہ طبع جس میں ہر عورت کی سعادت کا انحصار ہے اور یہی پردہ عورت کو اپنی ان اعلیٰ خصوصیتوں کو نشو ونما دینے کا موقع دیتا ہے جو اس معرکہ زندگانی میں اس کے یکتا ہتھیار ہیں۔

۶۔ مادی مدنیت کی عورتوں میں چاہے جس قدر ظاہری نمائش اور دلفریبی پائی جاتی ہو لیکن وہ کامل جنس نسواں کا نمونہ یا کمال نسوانی کے راستہ پر چلنے والی ہرگز نہیں ہیں اور خود ان ممالک میں تعلیم نسواں کے طریقے عورتوں کی حالت کے لیے مفید اور مناسب نہیں جس کی شہادت وہیں کے علماء کے اقوال سے بہم پہنچتی ہے۔

۷۔ اسلام نے عورت کے بارے میں جو ہدایتیں کی ہیں وہ فطرت نسوانی سے پوری طرح مطابق اور موافق ہیں۔ گویا اسلامی تعلیمات کے جملہ خصائص اور ملکات کو اچھی

صورت میں ڈھالنے کے لیے اعلیٰ درجہ کے سانچے سے مشابہ ہیں یعنی اگر ان تعلیمات کے موافق عورت کے خصائص نشو ونما پائیں تو مسلمان خاتون بہت اعلیٰ درجہ کی کامل و اکمل عورت بن سکتی ہے۔

۸۔ مسلمان خاتون میں کمال جنس نسوانی کے اعلیٰ واکمل مرکز تک پہنچنے میں صرف اتنی ہی کمی ہے کہ وہ صرف علم ضروریہ کے مبادی سے بے خبر ہے اور اسے تعلیم دے دی جائے تو پھر اس میں کوئی نقص باقی نہیں رہے گا۔

یہ سب تو مسائل ہیں جن کے ثبوت میں مشاہدات اور واقعات اور تجربہ کے علوم کے زبردست اصول پیش کر کے میں نے استدلال کیا ہے یا موجودہ زمانہ کے سب سے بڑے علمائے تمدن وعمران کے اقوال سے استشہاد کیا ہے نیز اس بحث میں میں نے جہاں تک بن پڑا فلسفہ اور علمی (پریکٹیکل سائنس) کے اسلوب کا امتیاز رکھا ہے۔ گو اس میں سخت مشقت اور دشواری پیش آئی تاہم میری اس سے دو اعلیٰ درجہ کی غرضیں تھیں جو حسب ذیل ہیں:

اول یہ کہ پردہ نسواں کے حامیوں کا پہلو قوی کیا جائے تا کہ ان پر پردہ کی رسم کو معترضین کے حملوں سے بچانے کے لیے، آخر دم تک ثابت قدمی دکھانا آسان بن جائے اور وہ عملاً اس بات سے واقف ہو جائیں کہ حق انہی کی جانب ہے اور ان کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ دنیا کی ہر حرکت خواہ وہ بظاہر کسی حالت میں نظر آتی ہو، دراصل اس کا رخ ہر کاروبار زندگی میں فطرت انسانی کے اصلی مرکز ہی کی طرف ہوگا اور ہر طرف وہی ہوگا جس کی ہدایت ہمارا دین حنیف فرماتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ مسلمانوں میں بری قسم کا اور قابل افسوس تعصب ہرگز نہیں پایا جاتا مگر یہ ضرور ہے کہ وہ ان نئی بدعتوں کے انبوہ میں فطرت سلیمہ کے طریقہ زندگی کی گھوڑ دوڑ میں اور قوموں سے پیچھے ہوں لیکن اس کی وجہ ان میں کسی اندرونی بیماری کا پایا جانا ضروری نہیں۔ ہاں چند خارجی اور سریع الزوال حالتیں ان کو لاحق ہو رہی ہیں جو معمولی کوشش سے دور ہو جائیں گی اور پھر مسلمانوں کی توانائی بحال ہو جائے گی۔ اس حیثیت سے مسلمان بہ حیثیت ان مادی مدنیت والوں کے باقی اور

قائم رہنے کے لیے زیادہ موزوں ہیں جن کی مدنیت نے انسانیت کا چہرہ بد نما بنانے اور فطرت بشری کو اس کے اکثر پہلوؤں سے مسخ کر ڈالنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ہے، یہاں تک کہ ان کی اس خلاف ورزی سے ان میں بہت سے ایسے مہلک امراض پیدا ہو گئے ہیں جو عنقریب ان کا خاتمہ کر دینے کی دھمکی دے رہے ہیں...... دوسری عرض یہ کہ ہمارے وہ بھائی جو خواہ مخواہ ہاتھ دھو کر پردے کے پیچھے پڑ گئے ہیں، اس بات کے قائل ہو جائیں کہ ہم نے تعصب اور رسم و رواج کی کورانہ تقلید کی وجہ سے پردہ کی حمایت نہیں کی ہے بلکہ ہمارا یہ فعل فطرت کی امداد و اعانت کے لیے سرزد ہوا ہے اور فطرت کیا ہے؟ دین اسلام۔ ہم اسی صریح حق کی جانبداری کرتے ہیں جو اس دنیا میں صرف مسلمان کے حصہ میں آیا ہے تا کہ شاید ہمارے مہربان صحیح غور کے بعد بجائے اپنی پردہ داری پر آمادہ ہو جائیں اور ہمارے ہم آہنگ بن کر ان علامات مرض کو زائل کرنے کی کوشش کریں جو ہماری مصیبت کا باعث بن گئی ہیں اور اس طرح ہم اس مقدس فرض کو بھی ادا کر سکیں گے جو ہمارا ضمیر قوم و ملت کے لیے ہم پر واجب قرار دیتا ہے۔

❊ ❊ ❊

حواشی

۱ التوضیح فی اصول التشریح، مطبوعہ بیروت، ص۱۲

۲ (اَلمَرْاَۃ الجدیدہ، قاسم امین بک ص۱۲)

۳ سائیکلوجی کا عربی ترجمہ مصنف نے ''علم التنفس بالتجارب کیا ہے۔ یہ وہ علم ہے جس سے انسان کے نفس اور دماغ کی اصلی ہیئت معلوم ہوتی ہے۔ (دیکھو چیمبرز ڈکشنری صفحہ ۴۵)

۴ مصنف نے دماغی قوت پر بحث کرتے ہوئے دماغ کے وزن اور مخ کے اختلاف پر قصداً یا سہواً توجہ نہیں کی حالانکہ عورتوں کے اصلی ضعف کی بنیاد اسی اختلاف پر ہے۔ دماغ کے وزن کے اختلاف ہم آگے چل کر دکھائیں گے لیکن بھیجے کی بحث میں مخ کے اختلاف کو جگہ دینی ضروری ہے۔ اصطلاح تشریح میں آخری حصے کو مخ کہتے ہیں۔ مرد کے دماغ میں بھیجے کے ساتھ مخ کی نسبت (۱) اور (۸/۴/۷) کی ثابت ہوئی ہے مگر عورتوں کے دماغ میں زیادہ سے زیادہ (۱) اور (۱/۴) کی نسبت ہوتی ہے۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ مخ دماغ کے ان اجزاء میں سے ہے جن کی مقدار کی زیادتی پر عقل اور فکر کی تیزی اور عمدگی کا دارومدار ہے۔'' (دیکھو التوضیح فی اصول التشریح صفحہ ۶۲۲)

۵ التوضیح فی اصول التشریح صفحہ ۴۰۷ کتاب مذکور ڈاکٹر یوحنا ورٹبٹ پروفیسر تشریح وفزیالوجی کی مستند تصنیف ہے۔ جدید تشریح میں اس سے بہتر کوئی کتاب عربی میں نہیں لکھی گئی۔ پہلی مرتبہ مصر میں چھپی پھر ترمیم و ترتیب کے بعد بیروت سے شائع ہوئی۔ بیروت کا ایڈیشن پیش نظر ہے۔

۶ المرأۃ الجدیدہ، قاسم امین بک ص۱۲
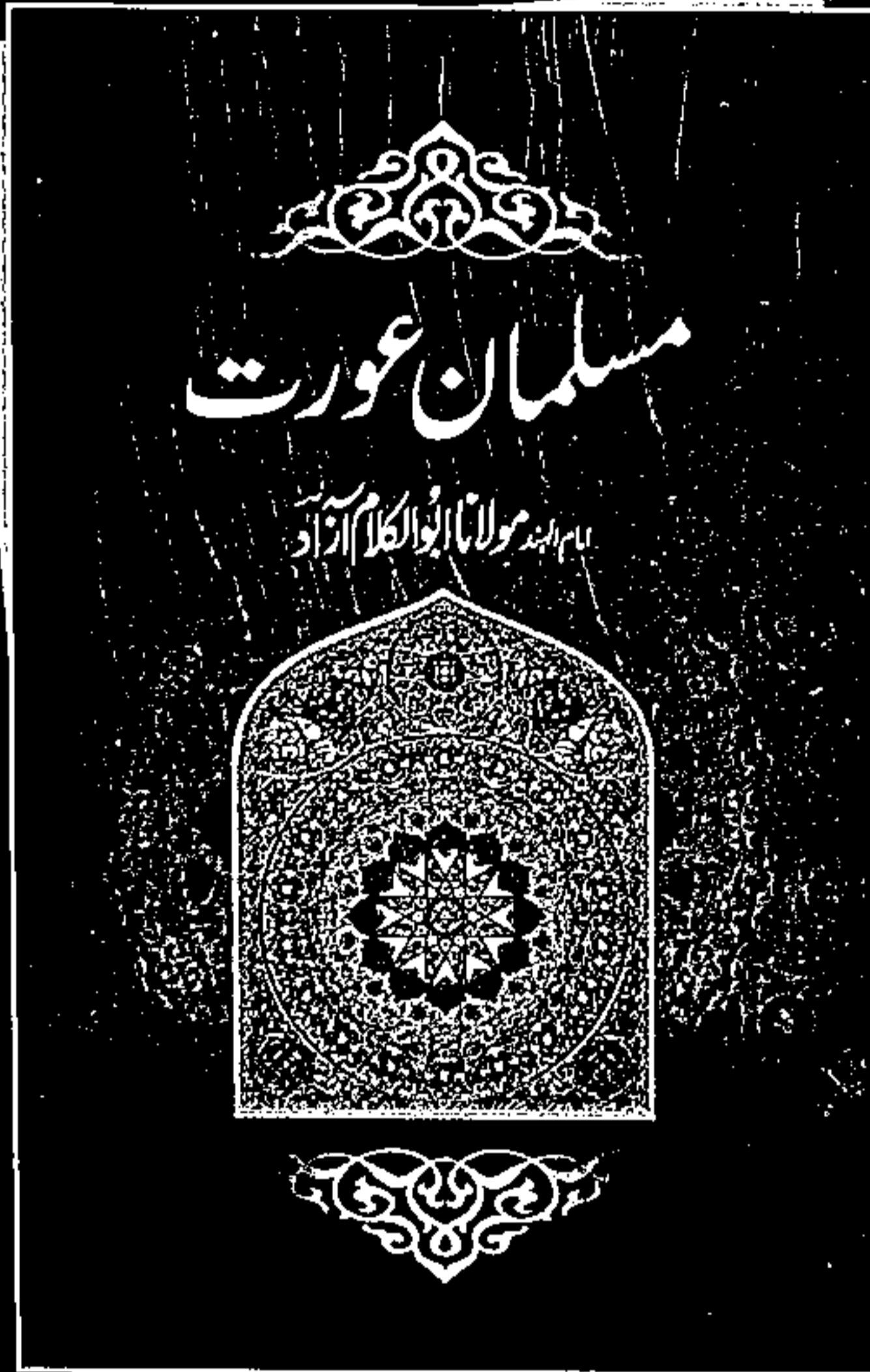
MAKTABA JAMAL

مکتبۂ جمال

تیسری منزل حسن مارکیٹ ۔ اردو بازار ۔ لاہور

Cell: 0322-4786128 Ph: 042-37232731
mjamal09@gmail.com - www.maktabajamal.com